اکتوبر 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور
لندن

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

صفحہ نمبر 5

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

هُوَالـــــــنّاصر

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم   گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور لندن

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 10 صفر/ربیع الاوّل 1443 اکتوبر 2021

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
بدر الدین کلہوڑو (بیورو چیف سندھ پاکستان)
محمد عرفان (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)
انس احمد (بیورو چیف لاہور)
ابن الامین (برطانیہ)
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
عجب خان (بیورو چیف بلوچستان)
حق نواز (بیورو چیف وسطی پنجاب)
چوہدری مقبول احمد (بھارت)

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ **لاہور** میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

اس شمارہ میں

4 درس قرآن کریم
5 اداریہ
6 مذاہب
7 آئین پاکستان کی دوسری ترمیم
8 جب حیدر آباد دکن کے آخری صدر اعظم بھارت سے کراچی فرار ہوئے
12 طالبان کی دو نسلوں سے میرے ذاتی رابطوں کی کہانی
15 علامہ اقبال کی خودکشی
16 ستمبر 1974 کا فیصلہ
18 جب بندہ بوڑھا ہو جاتا ہے
19 اندرون لاہور کے کوتوال
21 میڈیا مارشل لا کی تیاری
22 سر سید احمد خان ان انگلش میڈیم اور لبرل طبقہ
24 اکتوبر میں پیش آنے والے ملکی تاریخ کے اہم واقعات
26 بن برکھا برسات اور پت جھڑ کی تاویل آرائی
27 بھیرہ
29 12 اکتوبر: جنرل مشرف کا کراچی ایئرپورٹ پر لینڈنگ سے عزیز ہم وطنو تک کا سفر
33 صادقین نے اپنی اماں کی تصویر بنائی
34 بڑھاپا
35 نواز شریف کی وزارت عالیہ کے دور میں
37 ایران کے سپریم رہنما آیت اللہ علی خامنہ ای کی ذاتی زندگی
38 ابوریحان محمد بن احمد برونی
39 جابر بن حیان کے بارے جانئے
40 پانچ نوبیل انعام یافتہ سائنسدانوں نے بچوں کے لیے مضامین پیش کر دئے
41 دو دلچسپ واقعات
42 ہماری زندگیوں کو چیزوں کی کثرت کھا گئی ہے
43 انڈیا میں یہودیوں کی تاریخ
45 سائنس
46 مرزا شاہرخ سیر و شکار کیلئے دہلی سے کجلی بن تشریف لے جاتے ہیں (قسط اول)
49 استاد کا احترام
50 انسان نے لباس کب پہننا شروع کیا
53 ماحولیاتی تبدیلی عالمی وبا سے زیادہ ہلاکت خیز ہے
53 سویڈن کی ملکہ کے محل میں بھوت بھی رہتے ہیں
54 جنگل کا مولوی
55 ہماری کہانی
56 دنیا کے سب سے بڑے چہرے ادیوگی شیوا کے بارے جانئے
15-32 شعر و شاعری

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۹﴾

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۶۰﴾ (سورۃ النساء آیات ۵۹ تا ۶۰)

ترجمہ:

یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حقداروں کے سپرد کیا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان حکومت کرو تو انصاف کے ساتھ حکومت کرو۔ یقیناً بہت ہی عمدہ ہے جو اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بہت سننے والا (اور) گہری نظر رکھنے والا ہے۔1

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حکام کی بھی۔ اور اگر تم کسی معاملہ میں (اُولُوالامر سے) اختلاف کرو تو ایسے معاملے اللہ اور رسول کی طرف لَوٹا دیا کرو اگر (فی الحقیقت) تم اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ یہ بہت بہتر (طریق) ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ 1: یہاں امانت سے مراد انتخاب کا حق ہے جس کے نتیجہ میں حکومت کا اختیار ملتا ہے۔ پس ووٹ بھی ایک امانت ہے جو اسی کو دینا چاہئے جو اس کا اہل ہو۔ یہی سچی جمہوریت ہے۔ اور جب حکومت ملے تو پھر لازماً انصاف سے کام لینا ہے نہ کہ پارٹی بازی کا خیال کرنا ہے۔ آجکل کی جھوٹی جمہوریتوں میں اپنے پارٹی ممبروں کے ساتھ تو انصاف کیا جاتا ہے لیکن مخالف پارٹی سے انصاف نہیں کیا جاتا۔ 2: اس آیت کریمہ میں اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ میں مِنۡکُمۡ کا ترجمہ کرتے ہوئے بعض علماء یہ استنباط کرتے ہیں کہ مسلمانوں ہی میں سے اپنا حاکم بناؤ اور غیر مسلم حاکم کی اطاعت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک لغو عقیدہ ہے جو عمومی نظر ڈالنے سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ سب مسلمان جو غیر مسلم حکومت میں بستے ہیں یا وہاں ہجرت کر جاتے ہیں وہ ان کی حکومت کے قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو مسلمان حاکم ہو اس سے کسی معاملہ میں تنازعہ کا کیا سوال ہے جس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے۔ یہاں اللہ اور رسول سے واضح مراد قرآنی تعلیم ہے۔ پس کوئی بھی حاکم ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، اگر قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف عمل کرنے کا حکم دے تو ایسی صورت میں قرآن کی بات ماننا ہوگی نہ کہ حاکم کی۔

تفسیر:

اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا: خدا تعالیٰ کی مخلوق کا انتظام ایسے لوگوں کے سپرد ایسے لوگوں کے سپرد کرو۔ جو اس کے اہل ہوں۔ کمیٹیوں میں ممبروں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرو۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوبرو دو شخص آئے کہ ہمیں کام سپرد کیجئے۔ ہم اس کے اہل ہیں۔ فرمایا جن کو ہم حکم فرمادیں۔ خدا اُن کی مدد کرتا ہے۔ جو خود کام کو اپنے سر پر لے۔ اس کی مدد نہیں ہوتی۔ پس تم عہدے اپنے لئے خود نہ مانگو۔ اللہ تم کو حکم کرتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دو۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ: کہا مانو اللہ اور رسول کا اور اپنے حکّام کا۔

الٰہی خلفاء کی اطاعت وانقیاد وفرمانبرداری، سیاست وتمدّن کا اعلیٰ اور ضروری مسئلہ ہے! بلکہ ان کی فرمانبرداری خود الٰہی فرمانبرداری ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء:۸۱) اور فرمایا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ: جہنم والوں کو فرمایا۔ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ۔ کیا رسول دوزخیوں سے ہوں گے۔ پس مِنۡکُمۡ سے مراد نوعِ انسانی ہے۔ (حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۰)

حدیث:

حضرت محمود بن لبیدؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ایک دفعہ باہر نکل کر فرمایا: اے لوگو! شرکِ خفی سے بچو صحابہؓ نے عرض کیا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ! شرکِ خفی کیا ہے؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ایک شخص اس طرح نماز پڑھتا ہے اور اس کی خواہش و کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ مجھے اس طرح نماز پڑھتے دیکھیں اور بزرگ سمجھیں یہی دکھاوے کی خواہش شرکِ خفی ہے۔ (الترغیب والترھیب صفحہ ۳۲۔ الترھیب من الریاء بحوالہ ابن خزیمہ فی الصحیح)

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

اداریہ

نئی طالبان حکومت کو درپیش مسائل کا سامنا

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

نئی افغان حکومت افغانستان کو سیاسی برتری نے جہاں ان کی کامیابی کی راہ ہموار کی ہے وہیں ان کے بارے میں افغانستان سمیت دنیا بھر میں کئی طرح کے خدشات، خوف اور تحفظات پائے جاتے ہیں وجہ طالبان کا ماضی ہے۔ اب یہ نئی حکومت پر منحصر ہے کہ وہ حالات اور مستقبل کو کس حکمت عملی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر راقم الحروف زمینی حقائق قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے اور اللہ کرے اس ملک اور خطہ میں حالات کے پیش نظر خوشحالی اور امن نصیب ہو۔

نئی افغان حکومت کو پیش آنے والے مسائل میں ان کا اہم انتخابی نکتہ نظر ہے۔ موجودہ حالت میں ابھی تک افغان سیاستدان ان کے ساتھ طالبان ڈاکٹر عبداللہ، کرزئی اور گلبدین حکمت یار تک محدود ہیں اور یہ دیگر سیاستدانوں کے نظریہ سے بھی ملتے ہیں۔ پہلے تو امریکہ کی لڑائی طالبان فورسز کے ساتھ تھی اب امریکہ اور نیٹو کی فوج افغانستان سے جا چکی ہے۔ اب پورے افغانستان پر طالبان ہی کا قبضہ ہے۔ طالبان کے لئے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ امن اور سیکورٹی کس طرح قائم کرتے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو ملک میں مایوسی اور بدامنی پھیلے گی۔ 20 سالہ افغان جنگ میں امریکہ اور نیٹو فورسز کے ساتھ تو یہ اتحاد اور قوت کے ساتھ لڑیں ہیں لیکن اس صورتحال سے نمٹنا ان کے لئے مشکل ہے۔ امریکی اور نیٹو فورسز کے انخلاء کے بعد نئی افغان حکومت کو درپیش مسائل کے ساتھ اب ان کا امتحان شروع ہو گیا ہے جن میں کئی قسم کے مسائل ہوں گے۔ موجودہ حالات میں (شعبہ ہائے زندگی) میں سیاسی و ملکی استحکام قائم کرنا ملکی معیشت، امن وامان، انتخابی نکتہ نظر کو بحال کرنا، صحت اور تعلیم کا انتظام کرنے کے مشکل مراحل سے طالبان کو اور اس کے ہمدرد ممالک کے لئے یہ اہم ذمہ داری ہوگی۔ دیکھا جائے تو سابق حکومت کے حوالے سے طالبان کا پلڑا ابھاری ہے لیکن انہیں اب بھی ایسے چیلنجز کا سامنا ہے جن سے نمٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

گزشتہ 20 سالہ جنگ اور اب ان کی حکمرانی کے لئے ان کی کوئی تیاری اور منصوبہ بندی نہیں ہے۔ نئی افغان حکومت کے لئے پہلا مسئلہ اور چیلنج جو درپیش ہے وہ حکومت سازی ہے جو کہ تشکیل دیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ان کو داخلی اختلافات پر قابو پانا ہوگا اور جو ان کے اتحادی ہیں ان کو مکمل اعتماد میں لے کر فیصلے کرنا ہونگے۔ فیصلے کرتے وقت اتحادیوں کی ہمدردیاں اور ان کے مؤقف کا خیال اور احترام کرنا ضروری ہوگا۔ دوسرا اہم چیلنج طالبان کا انتخابی نکتہ نظر ہے۔ فی الحال سیاستدانوں کے ساتھ طالبان آپس میں گفت وشنید کرتے رہتے ہیں جن میں ڈاکٹر عبداللہ، کرزئی اور گلبدین حکمت یار ہیں۔ دریں اثناء سیاست دانوں کی ایک وسیع تعداد افغانستان میں طاقت ور قوتیں ہیں اور مقبول شخصیات طالبان کے مخالف محاذ پر ہیں اور طالبان سے لڑنے کو تیار بھی ہیں۔ اگرچہ طالبان نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر وہ ان کے ساتھ ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ طالبان نے انہیں اپنے نذاکرات میں شامل نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ان میں کئی افراد بااثر رہنما ہیں۔ ویسے تو تمام طالبان ملا ہیبت اللہ کی قیادت پر متفق ہیں لیکن ایک غیر مرئی تقسیم سیاسی اور نظامی (عسکری) موجود ہے۔ بعض طالبان رہنما سیاسی محاذ پر بہت اہم ہیں لیکن جنگی میدان میں ان کی حیثیت اہم نہیں۔ جبکہ بعض لوگ جنگی محاذ پر کلیدی حیثیت کے حامل تھے لیکن سیاسی اور سفارتی حلقوں میں ان کے نام زیادہ نمایاں نہیں۔ ملا ہیبت اللہ جنہیں طالبان الخطاب باب کہا جاتا ہے نے حالیہ دنوں میں گروپ کی کامیابی پر تاحال کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان کے متعلق قیاس اور عام تاثر ہے کہ وہ کچھ عرصہ قبل بیماری کے باعث یا پھر پاکستان میں ایک بم دھماکے میں مارے گئے ہیں اور طالبان ان کی موت کو خفیہ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو طالبان میں اندرونی کشیدگی بڑھ جائے گی اور اگر وہ زندہ ہیں تو طالبان کو متحرک کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر گروپ کی اندرونی کشیدگی جامع مستحکم قیامِ حکومت کے لئے وقت درکار ہوگا اور یہ مسئلہ

خود طالبان کے اندرونی چیلنجز میں سے ایک ہے۔
ملا برادر کا تعلق درانی قبیلے سے ہے وہ افغانستان میں اقتدار کی روایتی شکل کو اپنے والد کی میراث کا حصہ سمجھتے ہیں۔ایک طویل عرصہ میں یہ کشیدگی طالبان کے درمیان مزید نزاکت اور گروپ کی تقسیم کا باعث بن سکتی ہے۔
نئی افغان حکومت کے لئے دوسرا بڑا چیلنج ان دو قسم کے ایک ہی حکومت میں سمونا اور مطمئن کرنا ہے افغانستان کے جنوب، مشرق اور شمال کے درمیان توازن کو کس طرح لایا جائے۔کیونکہ طالبان کی زیادہ تر قیادت کا تعلق قندھار (جیسے پشتو میں لوئے قندھار کہتے ہیں) اس کا مطلب قندھار صوبہ نہیں جبکہ مشرق کے تمام صوبے ہیں۔یاد رہے سراج الدین حقانی کی بدری فورس ہے یہ فورس ان کے بھائی بدر الدین حقانی کے نام سے منسوب ہے۔چنانچہ یہ چیلنج ہے جو ان کو درپیش ہے اور یہ کہ پکتیا اور قندھار کے درمیان توازن کیسے لایا جائے۔
حکومت سازی کے ضمن میں یہ بھی ایک چیلنج ہے مغرب نہیں بلکہ ایران، پاکستان، روس اور وسط ایشیائی ریاستوں کا مطالبہ ہے کہ ان پر مشتمل جامع حکومت تشکیل دی جائے۔ جس میں تاجک، ازبک، ہزارہ، خواتین اور سابقہ حکومت کے اہم احباب کو اس میں نمائندگی دی جائے۔لیکن طالبان میں ایک بڑا طبقہ کا خیال ہے کہ ہم ان کو حکومت میں کیوں شامل کریں جن سے ہم سابقہ جنگ لڑ رہے تھے۔دوسری طرف حامد کرزئی، گلبدین حکمت یار اور ڈاکٹر عبداللہ جیسے بڑے لوگ چھوٹے عہدے نہیں لیں گے اور طالبان ان کو یہ عہدے نہیں دیں گے۔علاوہ ازیں کئی ایسے گروپ ہیں جو ناخوش ہیں لازمی طور پر ان کے مقاصد پورے نہیں ہوتے تو وہ مغرب یا امریکہ کی طرف دیکھیں گے جس سے طالبان کے لئے مسئلہ ہوگا۔
18 ستمبر کی اشاعت بی بی سی اردو سروس کے نامہ نگار ماجد نصرت کا کہنا ہے کہ مرکزی دھارے کی طالبان لیڈرشپ کے لئے جو جنوب قندھار میں ہے سب سے بڑا چیلنج حقانی نیٹ ورک ہے جو اب زیادہ دلیر ہو چکا ہے اور جس کے روابط غیر ملکی جنگجوؤں سے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی افغانستان کے نصف سے زیادہ حصے پر اس کا کنٹرول ہے۔اس مسائل کے مجموعے نے طالبان کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی حکومت کے بارے میں اندرونی اور بیرونی بین الاقوامی خدشات پر اندرونی اتحاد و اتفاق کو ترجیح دیں جو کہ پرانی قیادت پر مبنی ہے اور جس میں سے ملک کی غیر پختون آبادی کو باہر رکھا گیا ہے۔جنگ میں ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت پر موجودہ طالبان اختلاف سے ہٹ کر تاریخی قبائل شکوے شکایتیں بھی غیر محسوس انداز میں زیرِ سطح سر اُٹھا رہی ہے۔جس کے نتیجے میں مشرق اور جنوب کے پختونوں کے درمیان مسابقت پیدا ہو رہی ہے۔نسلی پختون ملک کی آبادی کا تقریباً 40 فیصد ہے جو دو بڑی شاخوں میں تقسیم ہے۔درانی اور غلزئی زیادہ تر خانہ بدوش رہے ہیں۔حقانی لیڈر غلزئی ہیں اور ان کا نیٹ ورک طالبان کا حصہ ہے مگر کارروائی اور مالیاتی لحاظ سے انہیں خاصی خودمختاری حاصل ہے۔اس کے علاوہ ان جنگجوؤں اور شمالی افغانستان کے غیر پشتون طالبان سے ان کے قریبی روابط ہیں اور یہ سخت گیر گروہ ہے۔مبینہ طور پر پاکستان کی خفیہ ایجنسی ISI کے بھی قریب سمجھا جاتا ہے۔
نظریاتی طور پر یہ القاعدہ اور دولت اسلامیہ خراساں کے بھی قریب ہے۔افغان امور کے ماہر مائیکل سیمپل جخفون نے بہت برس افغانستان میں کام کیا ہے۔BBC فارسی ٹی وی سے حال ہی میں بات کرتے ہوئے کہا کہ مسائل کے ساتھ طالبان کی اندرونی لڑائی اور اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش نے افغان عوام کی نظر میں پہلے سے ان کی کم قدر میں اضافہ کیا ہے اور ان کا کہنا تھا کہ اب طالبان کا ''ہنی مون'' ختم ہو گیا ہے۔
ایک اور بڑا چیلنج جو نئی افغان حکومت کو درپیش ہے وہ طالبان کے کئی رہنما جن میں عبدالقیوم ذاکر اور سراج الدین حقانی جیسے لوگ جو امریکہ اور اقوام متحدہ کی بلیک لسٹ میں شامل ہیں اور یہ درجنوں بلیک لسٹ لوگ امریکہ کی ایما پر بغیر بلیک لسٹ سے باہر نہیں نکل سکتے علاوہ امریکہ نے ابھی سے افغانستان کے 9 ارب ڈالر کے اثاثے بھی منجمد کر رکھے ہیں۔
متذکرہ بالا چیلنجز اور درپیش مسائل اور ان دو انتہاؤں کے درمیان توازن کو قائم کرنا اور دونوں فریقوں کو مطمئن کرنا نئی افغان حکومت کے لئے بڑے مسائل ہیں۔

❁❁❁

مذاہب

to search اہم مذاہب کو ظاہر کرنے والا دنیا کا نقشہ۔مذہب کا لفظی مطلب راستہ یا طریقہ ہے۔انگریزی لفظ Religion کا مادہ لاطینی لفظ religio یعنی امتناع، پابندی ہے۔ویبسٹر کی انگریزی لغت میں Religion کی جو تعریف کی گئی ہے اس سے ملتا جلتا مفہوم مقتدرہ قومی زبان کی انگریزی اردو لغت میں بھی دیا گیا ہے، جو یوں ہے: ''مافوق الفطرت قوت کو اطاعت، عزت اور عبادت کے لیے بااختیار تسلیم کرنے کا عمل؛ اس قسم کی مختار قوت کو تسلیم کرنے والوں کا یہ احساس یا روحانی رویہ اور اس کا ان کی زندگی اور طرز زیست سے اظہار؛ متبرک رسوم و رواج یا اعمال کے سرانجام دیے جانے کا عمل؛ خدائے واحد و مطلق یا ایک یا زیادہ دیوتاؤں پر ایمان لانے اور ان کی عبادت کا ایک مخصوص نظام۔
''بہ الفاظ دیگر کسی مخصوص علاقے کی مذہبی روایات کی تہ میں وہاں کے لوگوں کا کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز کارفرما ہوتا ہے۔مثلاً زراعتی معاشروں میں بارش کا دیوتا ہوتا ہے تو خانہ بدوش معاشروں میں شکار کا۔یہ کہنا درست نہیں کہ مذہب اپنے سے متعلقہ علاقہ کے لوگوں کی روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔بلکہ اس کے برعکس یہ کہنا چاہیے کہ کسی خطہ کے لوگ اپنے روحانی تقاضے پورے کرنے کے لیے جو امتناعات، پابندیاں، اُصول و قوانین، ضوابط وغیرہ عائد کرتے ہیں اُن کا مجموعہ مذہب کہلاتا ہے۔

❁❁❁

آئین پاکستان کی دوسری ترمیم

تحریر: لطف الاسلام

پاکستان کے مؤرخین جب اس قوم کی تاریخ کے فیصلہ کن مراحل کا ذکر کریں گے تو کوئی سن اڑتالیس کا ذکر کرے گا جب قائداعظم کی بے وقت وفات ہوئی۔ یا انچاس کا جب قرارداد مقاصد پاس کی گئی۔ یا اٹھاون کا جب ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کیا۔ ساٹھ کی دہائی کی جنگ اور ستر کی دہائی کی جمہوریت، آئین سازی اور دوبارہ مارشل لاء سے گزرتے ہوئے ہم اسی کی دہائی کے افغان جہاد اور جمہوریت کی دوسری قسط تک اور اس کے بعد کی دہائیوں کے پر تلاطم سیاسی، سماجی اور خارجہ عوامل کا ذکر پائیں گے۔

پاکستان کے ذمہ دار مورخین سے بصد احترام عرض ہے کہ انہوں نے تادم تحریر پاکستانی تاریخ کے ایک اہم موڑ کو قابل ذکر نہیں سمجھا۔ یہ کوئی جنگ نہیں تھی، کسی ڈکٹیٹر کا مس ایڈونچر بھی نہیں تھا، بانیان پاکستان کی غلطی یا کسی کلیدی شخصیت کا قتل بھی نہیں تھا۔ یہ معاملہ آئین پاکستان کی تخلیق کے ضمن میں ایک چھوٹے سے حاشیے کے طور پر ہماری تاریخ میں محفوظ ہے۔ اس حاشیے کے کلیدی کرداروں کی سیرت اور ان کے عوامل اور عزائم پر بھی چنداں غور نہیں کیا گیا۔

اس کے دوررس اور تباہ کن اثرات کا ادراک رکھنے والے بھی ایک دو ہی ہیں لیکن وہ بھی دبے لفظوں میں اس کو برا کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ مبادا کوئی ان معتبریت پر انگلی نہ اٹھالے۔ کچھ ہیں جو اس حاشیے کو ملک کی تاریخ کے معدودے چند درخشاں ابواب میں گنتے ہیں لیکن وہ بھی اس کے اثرات سے بے خبر ہیں۔ قارئین یہ بات ہے پاکستان کے آئین میں دوسری ترمیم کی جو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے ملک کے پہلے باقاعدہ آئین کے اجراء کے ایک سال بعد کی جس کی رو سے احمدی غیر مسلم قرار پائے۔ بھٹو کے ناقدین بھی اس ترمیم پر انہیں داد دیتے ہیں۔ جمہوری حکومتیں بہت دفعہ غیر جمہوری اقدام اٹھالیتی ہیں۔ امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ سلوک، اسرائیل میں فلسطینی حقوق کی پامالی، بھارت کے ہاتھوں کشمیر کا استحصال وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسا جدید تاریخ میں کبھی نہیں ہوا جو پاکستانی حکومت نے کر دکھایا۔ ایک پورے گروہ سے ان کا وہ حق چھینا گیا جو چھیننا ناممکن ہے۔ جی، ناممکن ہے۔ آپ زبان بندی کے قانون بنا سکتے ہیں لیکن سوچ اور احساسات پر ڈکٹیٹر ہو یا جمہور، کسی کا زور نہیں۔

یعنی ایک مذہبی گروہ کو یہ کہا گیا کہ وہ ۷ ستمبر ۷۴ سے وہ مذہب نہیں رکھتے جس کے وہ پیروکار ہیں۔ ٦ ستمبر کو جو شخص مسلمان تھا، ۷ ستمبر کو اس پر لازم ہوا کہ وہ خود کو غیر مسلم سمجھے۔ اگرچہ کہ اس ترمیم کو قانونی لبادہ اوڑھانے کے لئے جنرل ضیاء نے امتناع قادیانیت آرڈیننس سن چوراسی میں نافذ کیا، لیکن اس ظلم عظیم کی بنیاد کا سہرا بھٹو اور ان کے ہم عصر اسمبلی ممبران کو ہی جاتا ہے۔ اس اسمبلی نے جون تا ستمبر ۱۹۷۴ وہ کام کیا جس کا خمیازہ پاکستان ابھی تک بھگت رہا ہے۔

یعنی تکفیریت کو قومی کردار کا حصہ بنا دیا گیا۔ جس نے ایسے ایسے عفریتوں کو جنم دیا جو بریدہ سروں سے فٹبال کھیلتے، معصوم بچوں کو ذبح کرتے اور مساجد اور معبد کو دین کے نام پر پامال کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اسمبلی کے ممبران میں سیکولر لبرل بھی تھے، کمیونسٹ اور قوم پرست بھی۔ اور سب سے آگے علماء اور ان کے ساتھ مقبول اور محبوب بھٹو صاحب۔ اسمبلی کی بند کمرہ کی کارروائی کا ریکارڈ پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ علماء نے تکفیر کے وہ تمام طریقے آزمائے جو سب فرقے ایک دوسرے کے خلاف صدیوں سے آزماتے چلے آئے ہیں۔

اور اسمبلی کی اکثریت جو مذہب سے نابلد تھی ان میں سے کچھ نے اعتراض کیا کہ ان سے وہ کام کروایا جا رہا ہے جس کے وہ قابل ہی نہیں۔ کچھ نے یہاں تک پوچھا کہ ایک فرقے کو دائرہ اسلام سے باہر کرنے سے پہلے آپس کے فتاویٰ تکفیر پر بھی علماء کچھ کہہ دیں لیکن ان کو بھی چپ کروا دیا گیا۔ اب بھی ہر بڑے فرقہ کے مولوی دوسروں کو شرم دلاتے نظر آتے ہیں کہ دوسری آئینی ترمیم تو ان کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ان کے عقائد بھی احمدیوں کی طرح کافرانہ ہیں۔

بس بھلا ہو ان کے مفتی، مولانا یا علامہ کا، انہوں نے ایسے قطعی دلائل دیے کہ اسمبلی کے ممبران کی موٹی عقلوں میں بات آگئی۔ تکفیریت کا کھیل سرکاری پیمانے پر شروع ہوا۔ اہل تشیع کی زندگی اجیرن ہوئی، پھر ایک ایسا دور آیا جب تکفیری مقررین کی کیسٹیں فلمی گانوں کی البموں کی طرح دکانوں پر بیچی جاتی تھیں۔ ہمارے مورخ اور تبصرہ نگار امریکہ پر انگلی اٹھاتے ہیں اور را اور موساد کو ہر شنیع فعل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو اس ملک کے معصوموں پر روا رکھا جاتا رہا ہے۔ ایسے اندھے مورخین اور تبصرہ نگاروں کو اس پنپتے ہوئے ناسور کا احساس کیوں ہو۔ تہذیبی نرگسیت پر مذہبی شدت پسندی کا بگھار لگا ہے اور عوام کالانعام اسی میں خوش ہیں کہ اس قوم سے بہتر کوئی قوم نہیں۔ سب اچھا ہے۔

❁❁❁

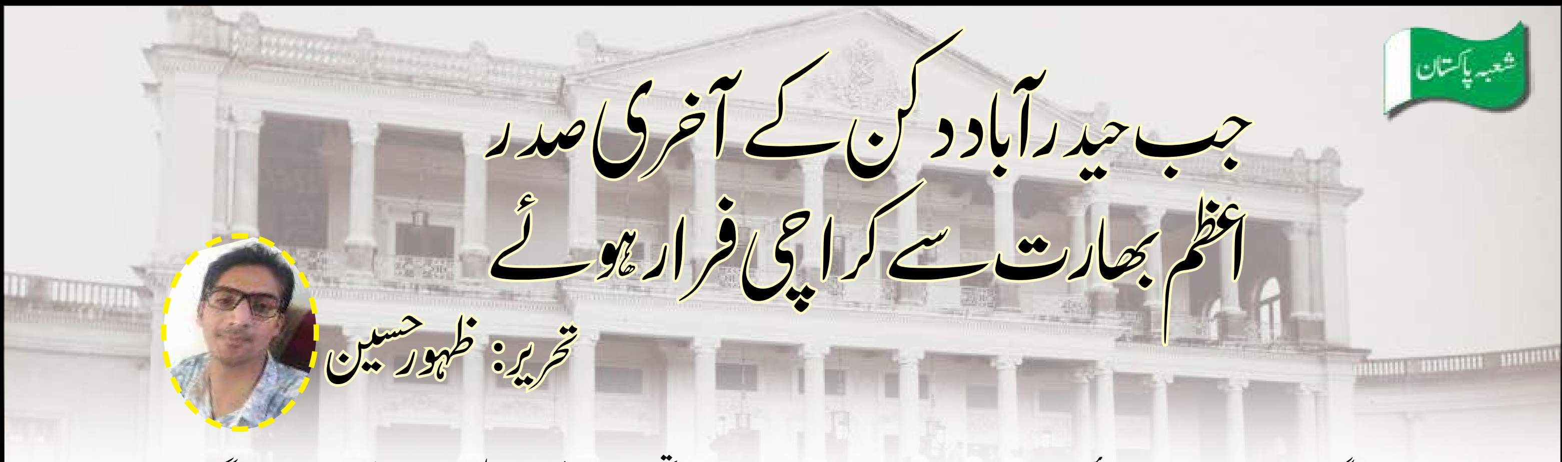

جب حیدر آباد دکن کے آخری صدر اعظم بھارت سے کراچی فرار ہوئے

تحریر: ظہور حسین

۷ مارچ ۱۹۵۰ بروز منگل بھارت اور پاکستان سے شائع ہونے والے متعدد اخبارات میں یہ سنسنی خیز خبر شائع ہوئی کہ حیدر آباد دکن کے آخری صدر اعظم میر لائق علی اپنی رہائش گاہ بیگم پیٹ (جسے سب جیل قرار دیا گیا تھا) سے فرار ہو کر کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس سنسنی خیز خبر کا بنیادی سورس (ذریعہ) ریڈیو پاکستان کی ایک خبر تھی جس میں کہا گیا تھا کہ حیدر آباد دکن کے صدر اعظم میر لائق علی نے دار الحکومت کراچی میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں شرکت کی ہے۔

باور کیا جاتا ہے کہ ریڈیو پاکستان نے جس تقریب میں لائق علی کی شرکت کا انکشاف کیا تھا وہ انھی کے خیر مقدم و استقبال کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ پاکستان میں اس وقت تعینات بھارتی ہائی کمشنر سیتا رام کو پہلے ہی کہیں سے لائق علی کی کراچی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ انھوں نے حیدر آباد دکن پر فوجی حملے کے منصوبہ ساز سردار ولبھ بھائی پٹیل (بھارت کے پہلے نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ) سے ٹیلیفونک رابطہ قائم کیا۔ سیتا رام نے علیک سلیک کے بعد ولبھ بھائی پٹیل سے پوچھا: 'کیا لائق علی کی نظر بندی ختم کی گئی ہے کہ وہ یہاں کراچی آ پہنچے ہیں؟' اس خبر سے پٹیل سخت پریشانی میں مبتلا ہوئے کہ کیسے ایک زیر حراست شخص، جو عالمی شہرت کا حامل ہو، بھارتی پولیس فورس اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں کو چکمہ دے کر اتنی آسانی سے کراچی فرار ہو سکتا ہے۔

سردار پٹیل سے رہا نہیں گیا اور انھوں نے فوراً حیدر آباد میں تعینات اپنے افسروں کو ٹیلیفون کیا اور ان سے جاننا چاہا کہ لائق علی کہاں اور کیسے ہیں۔ حقیقت سے نابلد افسروں نے انھیں جواب دیا کہ موصوف پچھلے چند ہفتوں سے علیل ہیں اور اپنی رہائش گاہ پر ہی نظر بند ہیں۔ سردار پٹیل نے کسی برہمی کا اظہار کیے بغیر حکم دیا کہ پولیس کا کوئی سینیئر افسر جا کر لائق علی کی مزاج پرسی کرے۔ جب پولیس کے انسپکٹر جنرل رینک کے ایک افسر بیگم پیٹ میں لائق علی کی رہائش گاہ پر پہنچے تو انھیں وہاں کمرے میں پلنگ پر لائق علی کی جگہ ایک تکیہ رکھا ہوا ملا اور ان کے اہل خانہ و ملازم گھر سے غائب تھے۔ پھر جب حیدر آباد میں تعینات چیف سویلین ایڈمنسٹریٹر ڈی ایس باکھلے نے سردار پٹیل کو بتایا کہ 'لائق علی فرار ہو گئے ہیں' تو آخر الذکر نے اول الذکر کو اس 'ہزیمت ناک لاپرواہی' پر خوب ڈانٹ پلائی۔ اسی دوران حیدر آباد دکن میں میر لائق علی کے فرار کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور افواہوں کا بازار بھی گرم ہو گیا۔ کہیں افواہ تھی کہ 'صدر اعظم' ایک بڑی دیگچی میں بیٹھ کر گھر سے فرار ہو گئے، کہیں یہ افواہ پھیلی تھی کہ وہ برقعہ پہن کر گھر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کہیں یہ افواہ تک تھی کہ وہ ایک خصوصی ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر پاکستان چلے گئے۔

فرار کی کہانی سامنے لانے والے مسلمان افسر

بھارتی حکومت نے میر لائق علی کے کراچی فرار ہونے کے واقعہ کی تفتیش کے لیے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بی این ملک کو حیدر آباد روانہ کیا۔ حیدر آباد پہنچنے پر آئی جی پی جیٹلے اور کمشنر سٹی پولیس ایس این ریڈی کو ان کے ساتھ تعینات کیا گیا۔ ان تینوں نے بھارتی حکومت کے احکامات پر مقامی کرائم انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ یا سی آئی ڈی کے مسلمان افسر فضل رسول خان ناغڑ کو بھی تفتیشی ٹیم میں شامل کر لیا جنھوں نے کچھ ہی گھنٹوں میں پتہ لگایا کہ لائق علی کس طرح اپنی رہائش گاہ سے فرار ہو کر کراچی پہنچے۔ اپنے زمانے میں حیدر آباد دکن کے شرلاک ہومز کہلائے جانے والے فضل رسول کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب 'سراغ رسانی اور تفتیش' کو ان کے بیٹے محمد مرتضیٰ علی خان نے سنہ ۱۹۸۱ میں حیدر آباد دکن سے شائع کرایا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سی آئی ڈی کے افسر فضل رسول کو لائق علی کے فرار کی پوری کہانی ان (لائق علی) کی ہمشیرہ شوکت النسا بیگم اور ان کے صاحبزادے فصیح الدین، دیگر عزیز و اقارب اور ڈرائیوز سے معلوم ہوئی۔ کتاب میں لکھا ہے: 'بھارتی حکومت نے یہ معلوم کرنے میں بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کی کہ آخر لائق علی اتنے کڑے پہرے سے کس طرح بچ کر نکل گئے۔ حیدر آباد میں شک کی بنا پر بہت سی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، نظام حیدر آباد کی حکومت کے وزرا و عہدیدار جو اپنے گھروں پر نظر بند تھے کو سینٹرل جیل منتقل کیا گیا، لائق علی کے رشتہ داروں، عزیز و اقارب اور ان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو نظر بند کر دیا گیا۔' جب بی این ملک اور ان کی ٹیم تین دن تک لائق علی کے فرار ہونے کے طریقہ کار کا انکشاف نہ کر سکی تو بھارتی حکومت نے ہدایت دی کہ مقامی سی آئی ڈی عہدیدار فضل رسول خان کو بھی شریک تفتیش کیا جائے۔ شاید میر اذکر کے ایم منشی (ایجنٹ جنرل آف انڈیا ان حیدر آباد سٹیٹ) کی اُن رپورٹس میں تھا جو وہ بھارتی حکومت کو پیش کیا کرتے تھے۔

'بہر حال میں نے اندرون تین گھنٹے تفتیش مکمل کر لی۔ لائق علی نے فرار ہونے کے لیے کوئی غیر معمولی یا محیر العقول طریقہ استعمال نہیں کیا تھا۔ ہر قدم پر ان کے گرفتار ہونے کا امکان موجود تھا۔ ان کی قسمت نے ان کا ساتھ دیا وہ بچ کر نکل گئے۔'

لائق علی کے فرار کا منصوبہ

فضل رسول خان ناغڑ کی کتاب 'سراغ رسانی اور تفتیش' میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۸ میں بھارت کے

حیدرآباد دکن پر فوجی حملے کے بعد جب لائق علی کو نظر بند کیا گیا تو شروع شروع میں ان پر نگرانی کافی سخت رکھی گئی۔ 'درمیان میں لائق علی نے حکومت سے کہا کہ نظر بند وہ ہیں نہ کہ ان کے اہل خانہ کہ ہر آنے جانے والے اور ہر گاڑی کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے۔ اس شکایت کے بعد پابندیوں میں نرمی لائی گئی اور کچھ عرصہ بعد تو ان سے کاروباری اصحاب، جن سے لائق علی کے بحیثیت صنعت کار تعلقات تھے، کو ملنے کی اجازت بھی دی جانے لگی۔

'نظام حکومت کے تمام نظر بند وزرا کی طرح لائق علی اور ان کے متعلقین کو بھی یہ توقعات تھیں کہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو بھارت کے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی جب بھارت کے خود مختار جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا تو اس وقت نظر بندوں کی رہائی کے احکامات بھی دیے جائیں گے۔

'۲۶ جنوری بھی آئی، دستور بھی نافذ ہو گیا اور حیدرآباد ریاست نے بھی باضابطہ طور پر انڈین یونین میں شرکت کر لی لیکن نظر بندوں کی رہائی کے احکامات صادر نہ ہوئے۔ لائق علی اور ان کے پاکستان میں رہنے والے ہمدردوں کو مایوسی ہوئی۔ 'نظر بندوں کی رہائی کے احکامات صادر نہ ہونے کے بعد لائق علی کے فرار ہونے کے منصوبے پر کام شروع ہوا اور ان کے قریبی ساتھی ایڈووکیٹ عبدالقوی کے ایک پاکستانی دوست نے بھارت آنا جانا شروع کیا اور سفر کے کاغذات کی ہوائی اڈوں پر کس طرح جانچ ہوتی ہے اور کیا کیا امور کی جانچ کی جاتی ہے دیکھنا شروع کیا اور ماہ فروری ۱۹۵۰ کے شاید آخری ہفتے میں وہ ضروری کاغذات کے ساتھ بھارت آئے۔'

فضل رسول کے مطابق فرار ہونے سے دو تین ہفتے پہلے لائق علی کی اہلیہ نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت بنگلے کے اندر اور باہر یہ افواہ پھیلائی کہ لائق علی سخت علیل ہو گئے ہیں۔ 'اس طرح نگرانی پر مامور پولیس اہلکاروں سمیت سب کو لائق علی کی علالت کا علم ہو گیا۔ ہر روز ان کی بیگم موٹر گاڑی میں صبح اور شام ڈاکٹروں کو لائق علی کی طبیعت کی اطلاع دینے کی غرض سے جاتی آتی رہیں۔ اس گاڑی کے شیشوں پر پردے لگے رہتے تھے۔ آتے جاتے اس گاڑی کو نہ تو روکا جاتا اور نہ تلاشی لی جاتی تھی۔ باہر آنے جانے کا سلسلہ ۱۰ سے ۱۲ دن سے زیادہ جاری رہا۔

'فرار کے مقررہ دن سے ایک روز پہلے لائق علی کی بڑی بیٹی عالیہ انہی کی گاڑی میں شام کے وقت اپنی پھوپھی شوکت النسا کے گھر جا کر پھوپھی سے کہہ کر آئی کہ کل دن کے ۱۰ بجے وہ اپنے مکان پر ایک گاڑی تیار رکھیں اور اس گاڑی کے ڈرائیور کا نہایت ہی اعتماد اور بھروسہ کا آدمی ہونا ضروری ہے۔ 'اس سے دو تین روز پہلے بنگلے میں لائق علی کے کسی عزیز کے یہاں شادی ہونے کی خبر پھیلائی جا چکی تھی۔ ان کے بچے شادی کے متعلقہ رسوم میں آتے جاتے رہے اور بنگلے سے پکانے کے بڑے برتن (بشمول دیگچیاں) بھی ایک روز لاری میں روانہ کیے گئے تھے۔'

لائق علی کا غلام احمد بن کر بمبئی سے کراچی کا سفر

فضل رسول خان ناغڑ کے مطابق: 'یکم مارچ ۱۹۵۰ کو خادمہ نے بلند آواز میں کوئی نو یا ساڑھے نو بجے صبح ڈرائیور کو آواز دی کہ بیگم صاحبہ کو دوائیاں لانے کی غرض سے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔' اس روز بیگم کی بجائے خود لائق علی گاڑی میں سوار ہو کر گھر سے نکل گئے۔ ان کی گاڑی ان کی بہن شوکت النسا بیگم کے مکان پر جا کر رکی۔ مکان کے احاطے میں شوکت النسا کے صاحبزادے فصیح الدین، جو نظام سٹیٹ ریلوے میں ملازم تھے، کی گاڑی لائق علی کی بیٹی عالیہ کی حسب خواہش تیار کھڑی تھی اور ڈرائیور بھی موجود تھا۔ لائق علی گاڑی سے اترے اور گاڑی کو فوراً واپس کر دیا تاکہ بنگلے میں تعینات پولیس اہلکاروں کو شبہ نہ ہو۔

'شوکت النسا نے اپنے بھائی لائق علی کو پانی پلایا۔ دونوں کے درمیان باتیں ہوئیں۔ پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ لائق علی بھانجے فصیح الدین کی گاڑی، جس کے شیشوں پر پردے لگے ہوئے تھے، سوار ہوئے اور بہن کے گھر سے روانہ ہو گئے۔ یہ گاڑی ایڈووکیٹ عبدالقوی کے گھر پر جا کر رکی جہاں پردے لگی ہوئی ایک اور گاڑی پہلے ہی سے کھڑی تھی۔

'لائق علی، ایڈووکیٹ عبدالقوی اور ان کی اہلیہ اب اس گاڑی میں سوار ہوئے جو گلبرگہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اس سے قبل ہی لائق علی کے ایک عزیز نے سکندرآباد سے بمبئی جانے والی ریل گاڑی میں ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ ریزرو کرا لیا تھا۔' لائق علی اور ان کے ساتھیوں کی گاڑی گلبرگہ جا کر درگاہ شریف کے سامنے رکی۔ وہاں انہوں نے فاتحہ پڑھی اور ریل گاڑی کے وقت سے چند منٹ پہلے گلبرگہ کے ریلوے سٹیشن پر آئے۔ عبدالقوی نے ڈرائیور کو کچھ دیر کے لیے روک لیا کیوں کہ ریل گاڑی اس روز ۲۰ منٹ یا نصف گھنٹہ تاخیر سے چل رہی تھی۔ 'ریل گاڑی کے آجانے کے بعد عام لوگوں کی طرح یہ تینوں اپنے ریزرو کمپارٹمنٹ کو کھول کر اس میں داخل ہوئے اور گلبرگہ سے روانہ ہو کر صبح چھ بجے کے قریب ان کی ٹرین بمبئی پہنچ گئی۔ سٹیشن پر کسی بڑے کاروباری کی گاڑی اس پارٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس گاڑی سے یہ تینوں اس کاروباری شخص کے یہاں گئے اور ناشتہ کیا۔

'وقت مقررہ پر لائق علی گاڑی کے ذریعے ہوائی اڈے پر سفر کے ضروری کاغذات کے ساتھ پہنچ گئے۔ غلام احمد کے نام سے ان کے لیے ہوائی جہاز میں سیٹ ریزرو کرائی جا چکی تھی۔ وہ اس نام سے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

'دوسری جانب ۲ مارچ ۱۹۵۰ کو لائق علی کے بچے اچھے کپڑے پہن کر اپنے رشتہ دار کے یہاں شادی میں شرکت کرنے جانے کے نام سے اپنے بنگلے سے نکلے اور ایک مہاجر ملازمہ کے ہمراہ نامپلی سٹیشن سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کی سیٹیں بھی پہلے ہی سے ریزرو کی جا چکی تھیں اور اگلی صبح بمبئی پہنچ گئے جہاں ایڈووکیٹ عبدالقوی ان کے منتظر تھے۔' ۳ مارچ ۱۹۵۰ کو بیگم لائق علی نے پہلے سے تیار کیے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں جن پر ملازمین کے ناموں کی چٹھیاں الگ الگ گڈی پر لگا کر رکھی تھیں اپنے پرانے خادم علی بن احمد باغزال، جو عرب شہری تھا، کے حوالے کیں اور ان سے تاکید کی کہ ۵ مارچ کو وہ ان نوٹوں کی گڈیوں کو جس جس کے نام کی ان پر چٹھی لگی ہے اسی ملازم کو دینا شروع کر دیں۔

'وہ بھی اپنی گاڑی میں خادمہ کے ساتھ نکلیں اور اپنے بھائی کے بنگلے گئیں۔ بھائی سے ملیں

اور وہاں سے سیدھا ہوائی اڈے پر پہنچ گئیں۔ دوپہر کے وقت بمبئی پہنچیں اور اپنے بچوں سے جا ملیں۔ یہ سب عبدالقوی کی سرکردگی میں دوسرے روز یعنی ۴ مارچ کو ایس ایس سابرمتی جہاز سے اپنے سمندری سفر پر روانہ ہو گئے اور بالآخر کراچی پہنچے۔

'لائق علی کی بھارت سے فرار کی خبر بھارت میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہیں پاکستان پہنچنے کے بعد جیسی رازداری برتنی چاہیے تھی ویسی نہیں برتی اور ایک تقریب میں حصہ لینے پہنچے جس کی وجہ سے ان کے فرار ہونے کی خبر سامنے آئی۔ 'لائق علی کے فرار ہونے کے بعد جب ان کے عرب ملازم نے نوٹوں کی گڈیاں تقسیم کرنا شروع کیں تو ملازمین انعامات لے کر بنگلے سے یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ اسی وقت نگرانی پر مامور پولیس اہلکاروں کو لائق علی کے فرار ہونے کا شبہ ہو چکا تھا لیکن اب سب سے پہلے جو بھی اطلاع دیتا وہی پھنس جاتا اس لیے خوف سے کسی نے بھی اطلاع نہیں دی۔ 'لائق علی کی حراست سے فرار میں مدد دینے کے الزام میں ان کی ہمشیرہ شوکت النسا بیگم، عرب ملازم اور دیگر کئی اشخاص کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ عدالت میں وکلا نے ایک قانونی عذر اٹھایا کہ لائق علی کی حراست یا نظر بندی ہی جائز نہ تھی اس لیے ملازمین پر فرار میں مدد دینے کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ تاہم ابتدا میں عدالت نے اس عذر کو تسلیم نہ کیا۔ 'پھر عدالت میں بحث کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ ریاست حیدرآباد دکن کے دستور العمل تحفظ امن عامہ کے تحت لائق علی کی نظر بندی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ تک ہی جائز تھی۔ چوں کہ حیدرآباد کا دستور العمل کالعدم ہو چکا ہے لہٰذا ان کی نظر بندی قانوناً جائز نہیں تھی۔ عرب ملازم علی بن احمد باغزال دوران تفتیش جیل میں فوت ہو گئے جبکہ باقی سب کو رہا کر دیا گیا۔'

حیدرآباد دکن میں ۱۹۴۰ اور ۱۹۵۰ کی دہائی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی معلومات رکھنے والے بعض مورخین کا کہنا ہے کہ لائق علی کی فرار میں سب سے بڑا ہاتھ ایڈووکیٹ عبدالقوی کا تھا جو پاکستان کے مسلسل رابطے میں تھے۔

ان کے مطابق جن جعلی سفری دستاویزات میں لائق علی کو غلام احمد بنایا گیا تھا ان کو پاکستان کے خفیہ ادارے انٹر سروسز انٹیلی جنس یا آئی ایس آئی نے تیار کروایا تھا۔

مورخ و مصنف نریندر لوتھر میر لائق علی کی ڈرامائی فرار کے متعلق لکھتے ہیں: 'ہم میں سے اکثر نے سنہ ۱۶۶۶ میں چھترپتی شیواجی کی اورنگزیب کی قید سے (پھلوں کی ٹوکری میں چھپ کر) ڈرامائی فرار کے بارے میں سنا ہی ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ ایسا پرانے زمانے میں ہی ممکن تھا۔' لیکن سنہ ۱۹۵۰ میں حیدرآباد کے آخری صدر اعظم کے ڈرامائی فرار کا قصہ بھی اتنا ہی دلچسپ ہے۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کو عمدہ انداز میں بنایا گیا اور جس پر شاندار طریقے سے عمل درآمد ہوا۔ صدر اعظم کی فرار نے بھارتی حکومت کو شرمندہ اور باقی دنیا کو حیران کر دیا تھا۔'

پاکستان کے وفادار

میر لائق علی کی پاکستان فرار ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کی پاکستان کے تئیں محبت اور وفاداری تصور کی جاتی ہے۔ انہیں محمد علی جناح نے سنہ ۱۹۴۷ میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا نمائندہ مقرر کیا تھا نیز انہی کی اجازت سے انہوں نے اسی سال کے آخر میں حیدرآباد دکن کے صدر اعظم کا عہدہ قبول کیا تھا۔ رمن راج سکسینہ اپنی کتاب 'تذکرہ دربار حیدرآباد' میں رقم طراز ہیں: 'یکم دسمبر ۱۹۴۷ کو میر لائق علی نے بحیثیت صدر اعظم اپنے عہدے کا حلف لیا۔ میر لائق علی کا نام مجلس (مجلس اتحاد المسلمین) نے اپنے نمائندے کے طور پر پیش کیا تھا جو غلام محمد وزیر (وزیر مالیات پاکستان) کے انکار کے بعد سب سے موزوں ملکی امیدوار سمجھے گئے تھے۔ 'عہدہ وزارت قبول کرنے سے پہلے لائق علی نے محمد علی جناح سے اجازت حاصل کی اور مسٹر جناح نے صرف ایک سال کے لیے اس عہدہ کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔'

'زوال حیدرآباد اور پولیس ایکشن' کے مصنف محمد مظہر الدین لکھتے ہیں: 'میر لائق تقسیم ہند کے بعد مجلس اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے کر اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔

'پاکستان کی صنعتی ترقیات اور کراچی کی بندرگاہ کی توسیع و تعمیر نو کی ذمہ داریوں کے پیش نظر قائد اعظم لائق علی کی خدمات کو حیدرآباد کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن پھر حالات کے مدنظر اور نظام حیدرآباد کی خواہش و اصرار پر اجازت دے دی۔' معروف مصنف و تجزیہ نگار اے جی نورانی اپنی کتاب 'دا ڈسٹرکشن آف حیدرآباد' میں لکھتے ہیں: 'غلام محمد، جو ریاست (حیدرآباد دکن) کے وزیر خزانہ رہ چکے تھے، بطور صدر اعظم نظام میر عثمان علی خان کی پہلی چوائس تھے، لیکن جناح انہیں پاکستان کے وزیر خزانہ کی حیثیت سے فارغ نہ کرنے پر مصر تھے۔ وہ (غلام محمد) بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے۔

'میر لائق علی کے نام کی تجویز سامنے آنے پر جناح نے نظام حیدرآباد کو ۱۸ نومبر ۱۹۴۷ کو ایک پیغام بھیجا کہ موصوف (لائق علی) پاکستانی حکومت کے ساتھ کیے گئے عہد وفا کے پیش نظر یہ پیش کش قبول کرنے پر تذبذب کا شکار ہیں۔'

لائق علی نے اپنی کتاب 'دا ٹریجڈی آف حیدرآباد' میں لکھا ہے: 'میں نے یہ پیش کش اس متفقہ شرط پر قبول کی کہ حیدرآباد دکن کا بھارت کے ساتھ کسی بھی مرحلے پر اور کسی بھی صورت میں الحاق نہیں کیا جائے گا۔' اے جی نورانی لکھتے ہیں کہ نظام حیدرآباد نے ایک ایسے شخص (لائق علی) کو اپنی حکومت کا سربراہ بنا کر بھارت کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے منتخب کیا تھا جو پاکستان کے وفادار بھی تھے اور اس ملک کے نزدیک بھی۔

محمد علی جناح نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ کو برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل کو ایک خط لکھا جس انہوں نے اپنی عمر سے ۲۷ سال کم عمر کے میر لائق علی کو اپنا ذاتی دوست قرار دیا۔

اے جی نورانی کا ماننا ہے کہ ایسا شاذونادر ہی دیکھا گیا کہ محمد علی جناح نے کسی کے بارے میں اتنی گرم جوشی سے لکھا ہو۔ خط کا متن کچھ یوں ہے: 'یہ خط لکھنے کا مقصد آپ کو میر لائق علی سے متعارف کرانا ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست ہونے کے علاوہ حیدرآباد کی صنعتی دنیا کی ممتاز شخصیات میں سے ایک ہیں اور اب وہ پاکستان کی صنعتی ترقی میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

'ان کا شمار برصغیر کی صنعتی و تجارتی دنیا کے قابل ترین سربراہوں میں ہوتا ہے اور وہ اس وقت حیدرآباد کی بڑی صنعتوں کے نظام کی سربراہی و نگرانی کر رہے ہیں۔

’میں سوچتا ہوں کہ آپ اپنا تھوڑا سا وقت نکال کر ان سے ملیں گے۔ وہ ۱۶ ستمبر کو منعقد ہونے والے اقوام متحدہ کے اجلاس میں ہمارے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کریں گے اور انہیں راستے میں کچھ دنوں کے لیے برطانیہ میں رکنے کو کہا گیا ہے۔

’ان کا تعلق حیدر آباد سے ہے اور وہ ہز ایکزالٹڈ ہائی نس دا نظام کی نگاہوں میں انتہائی قدر و عزت رکھتے ہیں۔ ’لہٰذا ان کو آپ سے ملنے کا موقع مل سکتا ہے تا کہ وہ برطانیہ اور پاکستان کے درمیان تجارتی امور پر بات چیت کر سکے کیوں کہ انہیں پاکستان کی تجارتی صنعتی ترقی میں نمایاں رول ادا کرنا ہے۔‘

تاہم اے جی نورانی کے مطابق: ’لائق علی نے (حیدر آباد کے لیے) برطانوی حکومت کی مدد حاصل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ وہ برطانیہ کے خارجہ سیکرٹری ارنسٹ بیون سے ملے، لیکن جناح کی طرف سے ایک تعارفی خط بھیجے جانے کے باوجود وہ ونسٹن چرچل سے مل نہ سکے۔ ’محمد مظہرالدین لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۴۷ میں بھارت اور حیدر آباد کے درمیان ایک سال کے لیے مشروط سٹینڈسٹل اگریمنٹ یا معاہدہ انتظام جاریہ طے پایا۔ ’اس معاہدے سے ایک دن قبل نظام حیدر آباد نے ایک فرمان مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ کے ذریعے حیدر آباد کے ایک نامور انجینئر و صنعت کار میر لائق علی کو صدارت عظمیٰ پر فائز کر دیا۔‘

جنت البقیع میں مدفون

۱۴ نومبر ۱۹۰۳ کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہونے والے میر لائق علی کا ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ میں انتقال ہوا لیکن تدفین جنت البقیع مدینہ منورہ میں ہوئی۔

’سقوط حیدر آباد‘ کے مصنفین ڈاکٹر عمر خالدی و ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں: ’میر لائق علی نے ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں اور انجینئر نگ کی اعلیٰ تعلیم برطانیہ کی مانچسٹر یونیورسٹی میں حاصل کی۔

’وطن واپسی کے بعد حیدر آباد میں کئی صنعتیں قائم کیں، جو بڑی کامیابی سے چلیں۔ ان صنعتوں میں سر پور پیپر مل اور حیدر آباد کنسٹرکشن کمپنی نے بڑی شہرت حاصل کی۔‘

محمد مظہرالدین کے مطابق لائق علی نے ہی حیدر آباد میں برصغیر کی سب سے بڑی فیکٹری ’نظام شوگر فیکٹری‘ کے نام سے قائم کی تھی۔

’میر لائق علی نہ صرف حیدر آباد اور برصغیر ہند میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی ایک بڑے صنعت کار اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ماہر کی حیثیت سے کافی مشہور تھے۔‘

’سقوط حیدر آباد‘ کے مصنفین لکھتے ہیں کہ کراچی پہنچ کر میر لائق علی نے حیدر آبادی مہاجرین کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

’حیدر آباد ٹرسٹ قائم کیا جس کے تحت کئی رفاہی ادارے اور ایک ہسپتال قائم ہوا۔ حیدر آبادی مہاجرین کے لیے حیدر آباد کالونی آباد کی۔

’متعدد کارخانے قائم کیے۔ افسوس کہ یہ کارخانے کامیابی سے نہ چل سکے۔ کراچی میں لائق علی نے حکومت پاکستان کی وزارت دفاع کے مشیر کی حیثیت سے بھی وقتاً فوقتاً کام کیا۔‘

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preperation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

طالبان کی دو نسلوں سے میرے ذاتی رابطوں کی کہانی

تحریر: حامد میر

پچیس سال پہلے مجھے طالبان ملیشیا سے یہ کہہ کر متعارف کروایا گیا تھا کہ یہ لوگ افغانستان میں "پائپ لائن پولیس" کا کردار ادا کریں گے۔ تب طالبان سے میرے رابطے کا انتظام اس وقت کی پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کیا تھا جو طالبان کی حمایت کرنے پر اپنی حکومت پر میری تنقید سے پریشان تھیں۔ انہوں نے اپنے وزیر داخلہ نصیر اللہ خان بابر سے کہا کہ وہ مجھے طالبان کے بارے میں آگاہ کریں۔

نصیر اللہ بابر پاک فوج کے ریٹائرڈ میجر جنرل تھے۔ انہوں نے میرے سامنے کئی بار اعتراف کیا کہ اس نے کئی معروف افغان باغیوں جیسے احمد شاہ مسعود، برہان الدین ربانی اور گلبدین حکمت یار کو ۱۹۷۵ میں فرنٹیئر کور کے آئی جی کی حیثیت سے اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (بے نظیر بھٹو کے والد) کے حکم پر پیسے اور ہتھیار فراہم کیے تھے۔ بابر نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ۱۹۷۵ میں افغان باغیوں کی حمایت شروع کی کیونکہ سردار داؤد کی قیادت میں افغان حکومت بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان میں دہشت گردی کی سرپرستی کر رہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی اور امریکی طالبان کی حمایت کر رہے ہیں کیونکہ امریکی آئل کمپنی یونوکل (UNOCAL) طالبان کو پائپ لائن پولیس کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔

زلمے خلیل زاد (جنہوں نے ۲۰۲۰ میں ملا برادر کے ساتھ دوحہ معاہدے پر دستخط کیے) نے ۱۹۹۷ میں امریکہ میں واقع یونوکل (UNOCAL) کے کمپنی دفاتر میں طالبان رہنماؤں کے دورے کا اہتمام کیا تھا۔ پاکستان میں سابق امریکی سفیر رابرٹ اوکلے اور حامد کرزئی بھی ان دنوں یونوکل (UNOCAL) کے لیے کام کر رہے تھے۔ نصیر اللہ بابر نے مجھے بتایا کہ یونوکل (UNOCAL) نے ۱۹۹۵ میں طالبان کو قندھار اور کوئٹہ کے درمیان مواصلاتی نظام قائم کرنے کے لیے رقم فراہم کی تھی۔ یونوکل (UNOCAL) چاہتی تھی کہ طالبان ترکمانستان سے افغانستان کے راستے پاکستان جانے والی گیس پائپ لائن کی حفاظت کریں۔ مرحوم ملا عمر سے میری پہلی ملاقات کا اہتمام بھی نصیر اللہ خان بابر نے کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ملا عمر خطے میں تیل کے لئے جاری کشمکش سے زیادہ آگہی نہیں رکھتے تھے۔ انہیں صرف افغانستان میں شریعت کے نفاذ میں دلچسپی تھی اور وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو ہمارے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرنا چاہیے نہ کہ ماتحت کی طرح۔ نصیر اللہ بابر نے برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں طالبان سے مذاکرات شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔

بابر کابل میں ایک وسیع البنیاد حکومت چاہتا تھا جو تمام نسلی گروہوں کی نمائندگی کرے۔ بے نظیر بھٹو امریکی دباؤ کے باوجود طالبان حکومت کو تسلیم کرنے سے گریزاں تھیں۔ بے نظیر حکومت گیس پائپ لائن منصوبے کا ٹھیکہ ارجنٹائن کی تیل کمپنی بریڈاس (Bridas) کو دینا چاہتی تھی۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ امریکی حکام نے انہیں یونوکل (UNOCAL) کے ساتھ معاہدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ بے نظیر حکومت کابل میں متحدہ قومی حکومت کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مشہور ازبک جنگجو عبدالرشید دوستم بھی طالبان کے ساتھ کام کرنے پر رضامندی ظاہر کر چکے تھے لیکن نومبر ۱۹۹۶ میں بے نظیر بھٹو کی حکومت اچانک برطرف کر دی گئی اور پس پردہ افغان امن مذاکرات ختم ہو گئے۔ پائپ لائن منصوبہ یونوکل (UNOCAL) کو مل گیا۔

اسامہ بن لادن کے ساتھ پہلا انٹرویو

بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے چند ماہ کے اندر میں نے جلال آباد کے قریب تورا بورا پہاڑوں میں اسامہ بن لادن کا پہلی بار انٹرویو کیا۔ مولوی یونس خالص نے تورا بورا غاروں میں میرا استقبال کر کے مجھے حیران کر دیا۔ اسامہ بن لادن کے ساتھ ان کا تعلق میرے لیے غیر متوقع تھا کیونکہ انہیں تو صوبہ ننگرہار کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اب ان کا بیٹا مطیع اللہ یونس طالبان کا سینئر لیڈر رہے۔ میں نے اسامہ بن لادن کا ۱۹۹۸ میں دوبارہ قندھار میں انٹرویو کیا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے طالبان نے قندھار میں اس لیے گرفتار کر لیا تھا کہ میں نے داڑھی نہیں رکھی تھی۔ مجھے القاعدہ کے جنگجوؤں نے طالبان کے چنگل سے چھڑایا۔

نائن الیون کے دو ماہ بعد اسامہ بن لادن نے مجھے کابل میں تیسرا انٹرویو دیا۔ جب میں اس خصوصی انٹرویو کے بعد واپس آ رہا تھا، ایک طالبان کمانڈر ملا خاکسار نے مجھے کابل کے باہر اقوام متحدہ کے احاطے کے قریب سے گرفتار کر لیا۔ میری گرفتاری کی وجہ میرے پاس ایک کیمرے کی موجودگی تھی۔ ان دنوں افغانستان میں کیمرے پر پابندی عائد تھی۔

میں نے وزیر دفاع ملا عبدالرزاق آخوند سے رابطہ کیا اور انہوں نے میری رہائی کا حکم دیا۔ انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں ایک کپ چائے کے لیے مدعو کیا اور معذرت مانگی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے جلد از جلد افغانستان سے نکل جانا چاہیے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ لوگ بھاگ رہے ہو؟ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا، "یہ کھیل کا حصہ ہے لیکن ہم یقینی طور پر واپس آئیں گے"۔

ملا عبدالرزاق آخوند ۲۰۱۰ میں ایک پاکستانی جیل میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کی پیش گوئی

۲۰ سال بعد ۱۵ اگست ۲۰۲۱ کو سچ ثابت ہوئی جب طالبان، ہموی گاڑیوں اور ٹینکوں پر سوار اپنا سفید جھنڈا لہراتے ہوئے دوبارہ کابل میں داخل ہوئے۔ بیس سال پہلے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے طالبان اور القاعدہ کے خلاف جنگ کے لیے 'صلیبی جنگ' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یہ اصطلاح بین المذاہب جنگوں کی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کل امریکہ میں صلیبی جنگ کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کا کچھ خاص مذہبی تناظر نہیں ہے۔ تاہم امریکی صدر کی طرف سے اس لفظ کے استعمال نے یقینی طور پر طالبان کی مدد کی۔ انہوں نے اپنی مزاحمت کو مذہبی رنگ دے دیا۔ جب بش نے بیس سال پہلے اپنی صلیبی جنگ شروع کی تھی تو طالبان کابل سے بھاگ رہے تھے۔ اب طالبان صدارتی محل میں بیٹھے ہیں اور امریکہ کابل سے بھاگ رہا ہے۔ اس صلیبی جنگ میں ہارنے والا کون ہے اور فاتح کون؟ ہمیں کسی نتیجے پر نہیں پہنچنا چاہیے کیونکہ میری نظر میں طالبان کا اصل امتحان ۱۵ اگست کے بعد شروع ہوا ہے۔

آج کے طالبان مختلف ہیں؟

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آج کے طالبان ۲۰۰۱ کے طالبان سے مختلف ہیں۔ میرے خیال میں وہ اب بھی اپنے پرانے نظریات پر قائم ہیں لیکن انہوں نے پچھلی دو دہائیوں میں کچھ نئے ہتھکنڈے سیکھے ہیں۔ ان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم دراصل ان کے نظریے کے گرد گھومتا ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ کئی برس سے قطر میں کام کرنے والے طالبان کے سیاسی دفتر کو آزادانہ فیصلہ سازی کا اختیار نہیں تھا۔ فیصلہ سازی کے اختیارات "رہبری شوریٰ" یا بالائی مشاورتی کونسل تک محدود ہیں اور اس کے بیشتر ارکان افغانستان کے اندر مزاحمت کا حصہ تھے۔ طالبان کے سپریم لیڈر ملا ہبیت اللہ اخوندزادہ مذہبی، سیاسی اور عسکری امور پر حتمی اختیار رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تین نائبین کی مشاورت سے فیصلے کرتا ہے۔

طالبان کے بانی رکن ملا عبدالغنی برادر سیاسی معاملات کو دیکھتے ہیں۔ ملا عمر کے بیٹے ملا یعقوب فوجی امور کے سربراہ ہیں اور افغانستان کے جنوبی علاقوں کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ مشہور افغان گوریلا کمانڈر مولوی جلال الدین حقانی کے بڑے بیٹے سراج الدین حقانی افغانستان کے مشرقی علاقوں کے نگران ہیں۔ یعقوب اور سراج الدین کو صوبائی اور ضلعی گورنر مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔

طالبان کی صفوں میں غیر پشتون

۱۹۹۰ کی دہائی کے وسط میں بھی غیر پشتون افغان طالبان کا حصہ تھے لیکن اب انہیں طالبان کی صفوں میں زیادہ عزت و احترام مل رہا ہے۔ طالبان نے تاجک، ازبک، ہزارہ اور ترکمان قومیتوں میں گہرا اثر و نفوذ حاصل کر لیا ہے۔ قاری دین محمد اور قاری فصیح الدین بدخشاں کے دو اہم تاجک طالبان رہنما ہیں۔ عبدالسلام حنفی فاریاب سے تعلق رکھنے والے ازبک طالبان رہنما ہیں۔ حال ہی میں، طالبان نے ایک نوجوان تاجک مہدی ارسلان کو پانچ شمالی صوبوں کا کمانڈر مقرر کیا۔ مہدی ارسلان کے انصار اللہ سے قریبی روابط ہیں۔ انصار اللہ نامی جماعت کو تاجکستان میں کالعدم قرار دیا گیا ہے۔ مہدی ارسلان تاجک، ازبک، ہزارہ اور ترکمان عسکریت پسندوں کے ساتھ شمال میں ایک طالبان فورس کی کمان کر رہا ہے۔ کچھ ازبک عسکریت پسندوں کے اسلامی تحریک ازبکستان سے قریبی روابط ہیں۔ گزشتہ سال طالبان نے ایک شیعہ ہزارہ مولوی مہدی کو شمال میں سرپل صوبے کا گورنر مقرر کیا تھا مولوی مہدی نے شمالی افغانستان میں طالبان کی حالیہ فتوحات میں اہم کردار ادا کیا۔

طالبان کے درجہ بندی میں ملا عبدالحکیم بھی بہت اہم شخص ہیں۔ وہ طالبان کے سابق چیف جسٹس ہیں اور ملا ہبیت اللہ کو سیاسی اور مذہبی امور پر مشورہ دیتے ہیں۔ طالبان کے کئی ترجمان ہیں۔ ذبیح اللہ مجاہد ۲۰۰۷ سے ترجمان کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہ ۱۴ سال تک افغان اور امریکی انٹیلی جنس کے لیے ایک معمہ بنے رہے جو ذبیح اللہ مجاہد کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

ذبیح اللہ مجاہد ۱۷ اگست کو پہلی بار بین الاقوامی میڈیا کے سامنے پیش ہوئے۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت افغانستان کے اندر گزارا اور مشرقی اور وسطی افغانستان میں عسکری سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ قاری یوسف احمدی ایک اور ترجمان ہیں جو جنوبی اور شمالی افغانستان میں فوجی سرگرمیوں کا حصہ ہیں۔ سہیل شاہین دوحہ میں طالبان کے سیاسی دفتر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انہوں نے نائن الیون سے پہلے پاکستان میں نائب سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ کابل ٹائمز کے سابق ایڈیٹر ہیں اور زیادہ تر طالبان کی سیاسی حکمت عملی پر بات کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم وردک دوحہ میں سیاسی دفتر کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے عربی زبان میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ طالبان قیادت میں ایک اور اہم شخص شیر محمد عباس ستانکزئی ایک سابق فوجی افسر ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ کی دہائی کے اوائل میں ہندوستان سے فوجی تربیت حاصل کی لیکن انہوں نے روسیوں سے لڑنے کے لیے افغان فوج کو چھوڑ دیا۔ ستانکزئی نے گزشتہ سال ماسکو میں کچھ ریٹائرڈ ہندوستانی سفارت کاروں سے رابطے کیے۔ نوجوان طالبان رہنما انس حقانی اساطیری افغان لیڈر مرحوم جلال الدین حقانی کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں۔ انہوں نے کئی سال بگرام جیل میں گزارے۔ وہ ایک شاعر ہیں۔ انہیں ایک آسٹریلوی مغوی ٹموتھی ویکس کے بدلے ۲۰۱۹ میں رہا کیا گیا تھا۔ انس اور ٹموتھی ویکس اب دوست بن چکے ہیں۔ انس حقانی ان دنوں گلبدین حکمت یار اور ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کی مدد سے کابل میں متفقہ حکومت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انس حقانی پاکستان کے بہت قریب سمجھے جاتے ہیں لیکن وہ پاکستان سے زیادہ طالبان کے وفادار ہیں۔ ابراہیم صدر، عبدالقیوم ذاکر، ملا عبدالواثق، امیر خان متقی، مولوی عبدالکبیر، شیریں اخوند، خیراللہ خیرخواہ، مطیع اللہ یونس، نوراللہ نوری اور شہاب الدین دلاور بھی طالبان قیادت میں بہت اہم ہیں۔ یہ سب ملا عمر کے وفادار تھے اور اب ملا ہبیت اللہ اخوندزادہ کے مطیع ہیں۔

کیا ملا ہبیت اللہ افغانستان میں جمہوریت کی اجازت دیں گے؟ یہ ایک بہت اہم اور بڑا سوال ہے۔ کابل میں نئی پارلیمنٹ کی عمارت کا کیا استعمال ہوگا جو بھارتی حکومت نے افغان

حکومت کو تحفے میں دی تھی؟ میری معلومات کے مطابق، طالبان تمام نسلی اقلیتوں، خواتین اور یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی نئی حکومت میں شامل کرنے کا فی لچکدار رویہ رکھتے ہیں لیکن انہیں "مغربی جمہوریت" پر سخت تحفظات ہیں۔

ایک طالبان رہنما نے مجھ سے آف دی ریکارڈ پوچھا کہ اگر امریکہ، برطانیہ، بھارت اور پاکستان سعودی عرب جیسی غیر جمہوری ریاست سے دوستی کر سکتے ہیں تو وہ مغربی جمہوریت کو افغانستان پر کیوں مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے ملا عمر، جلال الدین حقانی اور مولوی یونس خالص کی نسل کو دیکھ رکھا ہے۔ ان کے ساتھ شائستگی سے معاملات ہو سکتے تھے لیکن وہ سب لوگ کسی کی حاکمیت یا ڈکٹیشن قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے تھے۔ ان کے بیٹے ملا یعقوب، سراج حقانی اور مطیع اللہ یونس صرف حربوں میں اپنے بزرگوں سے مختلف ہیں تاہم ان کے تصورات عین میں وہی ہیں۔ اگر ان سے شائستگی سے پیش آیا جائے تو وہ بین الاقوامی برادری کی بات سن سکتے ہیں ورنہ اپنے باپ دادا کی طرح وہ ہمیشہ نئی جنگیں شروع کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے"، لاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

❁❁❁

علامہ اقبال کی خودکشی!

تحریر: وسعت اللہ خان

سب سے پہلے تو اس نشریاتی غازی کو سلام جس نے اس بے وقوف لڑکی کے سر پر اپنا پنجۂ شفقت رکھتے ہوئے پورے تام جھام نام کے ساتھ ہم جیسے کروڑوں سے اس عفیفہ کو متعارف کروایا۔

اس ابلاغی غازی کی انٹرویو وڈیو کو ہزاروں لائیکس ملے اور ہمیں اس لڑکی کے کردار کا ایکسرے، نیت کا سی ٹی سکین اور تر سے پیٹ بھرے جوانوں کو ورغلانے اور خود پر حملہ کروا کے سستی شہرت کو چوگنا کرنے اور اسلام و پاکستان کو ایک بار پھر بدنام کرنے کا شیطانی منصوبہ جاننے کا سنہری موقع ملا۔

اگر بچی کو پیدا ہوتے ہی دفن کرنے والے عربوں سے لے کر عورت کو چڑیل قرار دے کر زندہ جلا دینے والے پادریوں تک 'اے عورت تیرا دوسرا نام کمزوری ہے' جیسی شہرۂ آفاق لائن لکھنے والے عظیم شیکسپیئر سے بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مخالف سرسید احمد خان تک، بھری عبادت گاہوں میں حوروں کے ایک ایک عضو کی رسیلی تصویر کشی کرنے والے ریٹنگ سمیٹ پنج ستارہ مقبولِ عام مولویوں سے لے کر ریپ برائے ویزہ کے نظریے کے موجد پرویز مشرف اور بھڑکیلے کپڑوں سے جذبات بھڑکنے کی تھیوری کے داعی عمران خان تک سب ہی متفق ہیں کہ برائی کا منبع عورت ہے تو پھر عورت ہی شیطان کی چیلی ہے۔

یہ الگ بات کہ اسی شیطان کی چیلی نے ہی تمام عظیموں اور رزیلوں کو جنم دیا اور جنم دیتی رہے گی۔ جس جس نوجوان نے بھی اقبال پارک والی ٹک ٹاکر کے جسم کو مٹھائی سمجھ کر چھونے اور چکھنے کا لطف لیا، اسے یقین ہے کہ اس کی بہن ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے۔ جس نے ٹھٹھہ کے ایک دیہی قبرستان میں تازہ قبر کھود کر اس لڑکی کا کفن تار تار کر کے جھاڑیوں میں پھینکا۔ اس نے بھی شاید اپنی ماں کو کبھی نہ کبھی چادر ضرور خرید کے دی ہو گی۔

جس نے بھی کورنگی میں کچرے کے ڈھیر پر ایک تین سالہ بچی کی ریپ زدہ لاش دبائی ہو گی، اس نے بھی کبھی نہ کبھی ایک بار تو اپنی چھوٹی بہن یا بھانجی بھتیجی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا ہو گا اور شاید وہ ان گڑیوں پر میلی نظر ڈالنے والے کسی اجنبی سے کبھی گتھم گتھا بھی ہوا ہو۔

ایسا نہیں کہ ہماری آنکھوں میں شرم و حیا نہیں یا ہمیں اپنی اقدار کا علم نہیں یا ہمیں اپنے بزرگوں کی عزت پیاری نہیں۔ ہم ہر سگی بہن، بیٹی، بہو، ماں کا مکمل غیرت برتتے ہوئے احترام کرتے ہیں۔ دیگر گھروں، محلوں اور شہروں والے اپنی بہن بیٹیوں، ماؤں اور بزرگوں کے احترام و تحفظ کا وقت و حالات کے اعتبار سے خود اہتمام کریں۔

لیکن یہ سب لکھنے بتانے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنی ہاتھ سے نکلی عورتوں کا احتساب کرتے کرتے احترامِ زن کے بارے میں نبیِ کریم کی تعلیم، احکامات اور عملی رویے کا منبر سے بیان سنتے وقت آنکھیں نم کرنا بھول جائیں۔ ہم ایک مظلوم عورت کی آواز ہزاروں میل پرے حجاج بن یوسف کے کانوں تک پہنچ جانے والے واقعہ کو درسی کتب سے نکال دیں۔

ہم ہجوم میں گھری ایک دیسی ٹک ٹاکر کی اپنی انگلیوں سے کرداری ناپائی کی شدت میں کہیں سینتالیس کے فسادات میں اپنی عصمت کی حفاظت میں کنوؤں میں چھلانگ لگانے والی عظیم بچیوں کی دل سوز کہانی یاد نہ رکھیں۔ ہم فلسطینی عورتوں کو میلی نگاہ سے دیکھنے والے اسرائیلیوں، کشمیر کی مظلوم بیٹی کی آہ و بکا، مظلوم افغان عورت کی پیتا سن کر مٹھیاں بھینچ کر اس کی مدد و نصرت کے لیے بے تاب ہونا چھوڑ دیں۔ ہرگز ہرگز نہیں۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ چودہ اگست کو یہ واقعہ تصورِ پاکستان کی جنم بھومی لاہور کے اقبال پارک میں ہوا۔ جوانوں کو پیروں کا استاد سمجھنے والی روحِ اقبال مینارِ پاکستان کی نوک پر براجمان، ممولے کو شہباز سے لڑتے دیکھتی رہی۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اقبال کے اچھوں کو بھی گمان نہ ہو گا کہ دو ہزار اکیس کا شاہین اس شعر کو یوں بھی سمجھے اور برتے گا۔ ایسی کمال سمجھ کے بعد لوحِ مزار پر تصیح تو بنتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال - پیدائش: نو نومبر اٹھارہ سو ستتر - وفات: چودہ اگست دو ہزار اکیس (خودکشی)

❁❁❁

کچھ تو بولو کہ شبِ درد گزاری کیسے

احمد فراز

اتنے چُپ کیوں ہو رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
درد سے چُور ہوئے ہو کہ قرار آیا ہے
بھر گیا ہجر کا ہر زخم کہ جی ہار چلے
بجھ گیا شوق کہ پیغامِ نگار آیا ہے
نامرادی کی تھکن ہے کہ خمارِ شبِ وصل
جاں سلگتی ہے کہ چہروں پہ نکھار آیا ہے
کتنی اُجڑی ہوئی رت ہے کہ سکوں ہے نہ جنوں
اتنی بے فیض ہوئی بادِ بہاری کیسے
نہ کہیں نوحۂ جاں ہے نہ کہیں نغمۂ دل
کچھ تو بولو کہ شبِ درد گزاری کیسے
سر بہ زانو ہو تو کیوں چاک گریباں والو
بازی راہِ طلب جیت کے ہاری کیسے

❁❁❁

ستمبر ۱۹۷۴ کا فیصلہ

تحریر: جمیل احمد بٹ

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ملکِ عزیز میں عددی اکثریت کے بل پر دنیوی اغراض کے لئے کئے جانے والا اسمبلی کا فیصلہ درج ذیل وجوہ سے بے حقیقت تھا اور ہے۔

ا۔ بلا اختیار (without jurisdiction):

قرآن کریم نے دینی معاملات میں فیصلہ کا اختیار کسی اسمبلی کو نہیں دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ (نساء ۴:۶۰)

ترجمہ: اگر تم کسی امر میں اختلاف کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

اسی طرح فرمایا:

اَفَغَیۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِیۡ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡكُمُ الۡكِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام ۶:۱۱۵)

ترجمہ: (تو کہہ دے کہ) کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا ڈھونڈوں حالانکہ وہی ہے جس نے تم پر کھلی کھلی کتاب اتاری ہے۔

اور یہ اصول ٹھہرایا ہے کہ بین المذاہب جھگڑوں کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا اور ایسا قیامت کے دن ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ وَ النَّصٰرٰی وَ الۡمَجُوۡسَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا ٭ۖ اِنَّ اللّٰهَ یَفۡصِلُ بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ (حج ۲۲:۱۸)

ترجمہ: یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی بن گئے اور صابی اور نصرانی اور مجوسی اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا اللہ یقیناً ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔

پس کسی اسمبلی کا اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا قرآنی تعلیمات کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

۲۔ اہلیت نہ ہونا (incompetency):

وہ اراکین اسمبلی جنہوں نے یہ فیصلہ کیا دینی علم اور کردار کے لحاظ سے ایسا فیصلہ کرنے کے اہل نہ تھے۔ ضیاء الحق حکومت نے ان حضرات کے بارے میں جو قرطاس ابیض شائع کیا اس میں ان میں سے بیشتر کو خائن، راشی، جھوٹا، بدمعاملہ، بدعنوان، شرابی، زانی، اغوا میں ملوث، رسہ گیر، اسمگلر اور تخریب کار بتایا گیا۔ اس اسمبلی کا سربراہ چند سال بعد ملکی قانون کے تحت قتل کا مجرم قرار پا کر تختہ دار کا سزاوار ہوا۔ اور اس اسمبلی کے لاٹ مولوی مفتی محمود صاحب وہ تھے جن کی وطن دوستی کا پردہ اس وقت فاش ہو چکا تھا جب سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر انہوں نے فخریہ اعلان کیا تھا کہ 'خدا کا شکر ہے کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے'۔ کیا یہ لوگ دینی فیصلہ کرنے کے اہل تھے اور اہلیت نہ رکھنے والے ایسے لوگوں کے کئے گئے فیصلہ کی حیثیت کیا ٹھہرتی ہے؟

۳۔ سیاسی کھیل:

حقیقت یہ ہے کہ ربوہ اسٹیشن پر طلبہ کی ہلڑبازی سے لے کر دوسری آئینی ترمیم کی منظوری تک یہ سارا معاملہ ایک سیاسی کھیل تھا جس میں مولوی اپنی دانست میں بھٹو صاحب کو استعمال کر کے اپنے دیرینہ منصوبہ کو پورا کر رہے تھے اور دوسری طرف خود بھٹو صاحب مولویوں کے کندھوں پر سوار اپنے اقتدار کو ہمیشگی دینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

اسی پس منظر میں "ان کا خیال تھا کہ آئین میں اس ترمیم کا جو کریڈٹ حکومت کو ملنا چاہئے تھا وہ انہیں نہیں ملا ان کو شکایت تھی کہ۔۔۔ مولوی لوگ زبردستی اس کا سہرا اپنے سر باندھ رہے ہیں"۔ (اور لائن کٹ گئی از کوثر نیازی صفحہ ۱۵-۱۶ جنگ پبلیکیشنز فروری ۱۹۸۷ء)

اس ترمیم کی سیاسی بنیاد کا اعتراف الطاف حسین قریشی صاحب نے بعد میں ان الفاظ میں کیا 'جناب بھٹو صاحب نے مذہبی جذبہ کے تحت قادیانیوں کو غیر مسلم قرار نہیں دیا تھا پھر کیا وہ ایک سیاسی فیصلہ تھا؟ واقعات اس کٹھن سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں'۔

(اردو ڈائجسٹ لاہور مارچ ۱۹۷۶ء)

۴۔ آں حضرت ﷺ کی فرمودہ مسلمان کی تعریف کے مخالف:

آں حضرت ﷺ نے کسی شخص کے مسلمان قرار دئے جانے کے لئے اس کا کلمہ پڑھنا کافی سمجھا اور اس بدظنی کو کہ یہ پڑھنے والا دل میں کوئی اور خیال رکھتا ہے آپؐ نے سختی سے رد فرمایا جیسا کہ آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ پر اس وقت سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا جب انہوں نے کلمہ پڑھ لینے والے ایک شخص کو یہ کہہ کر قتل کر دیا کہ اس نے یہ دل سے نہیں پڑھا تھا۔ اس موقع کا درج ذیل مکالمہ اس باب میں یقیناً حرفِ آخر ہے۔

فرمایا 'اے اسامہ! تم نے اسے کلمہ توحید پڑھ لینے کے باوجود قتل کر دیا؟ انہوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول اس نے ہتھیار کے ڈر سے ایسا کہا تھا۔ تو آپ نے فرمایا 'افلا شققت عن قلبہ حتی تعلم اقالھا ام لا' کہ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس نے دل سے کہا یا نہیں؟ آپ ﷺ بار بار یہ بات دہراتے تھے'۔

(بخاری کتاب المغازی باب اسامہ بن زید)

ایک اور موقع پر آں حضرت ﷺ نے مسلمان کی یہ تعریف فرمائی:

من صلی صلوتنا و استقبل قبلتنا و اکل ذبیحتنا فذالك المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسول الله (صحیح بخاری کتاب الصلوۃ)

ترجمہ: جو شخص بھی ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے پس وہ مسلمان ہے اور اسے خدا اور اس کے رسول کی حفاظت حاصل ہے۔

اس دوسری ترمیم کے ذریعہ یہ اعلان کیا گیا کہ گویا آں حضرت ﷺ کے ارشاد، آپؐ کی سنت اور آپؐ کی بیان فرمودہ مسلمان کی تعریف درست نہ تھی اور اب گویا اس کی اصلاح کرتے ہوئے مسلمان ہونے کے لئے نئی شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ

۵۔ ریاستِ مدینہ کے آئین کے خلاف:

مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی جس کے سربراہ خود حضرت محمد مصطفی ﷺ تھے۔ آپ ﷺ نے انتظام حکومت کے ضروریات کے تحت مردم شماری کا حکم دیا۔ پوچھا گیا کسے مسلمان شمار کیا جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اکتبوا الی من تلفظ بالاسلام من الناس (صحیح بخاری کتاب الجهاد)

یعنی لوگوں میں سے جو زبان سے اسلام کا اقرار کرنے والے ہیں انہیں میرے لئے شمار کرو ارشاد رسول ﷺ سے ہمیشہ کے لئے طے شدہ اس اصول کے برعکس اس دوسری ترمیم کے تتبع میں آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسلمان ہونے کا زبانی اقرار نا کافی سمجھا گیا ہے اور یوں گویا عملاً یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کا فرمودہ اور سنت درست نہ تھا اب اس میں اصلاح کر دی گئی ہے نعوذ باللہ

۶۔اعلانِ تکمیلِ دین کے مخالف:

آں حضرت ﷺ کی تعلیم کے مطابق ابتدائے اسلام سے مسلمان ہونے کے لئے یہ طریق رہا ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھا جائے اور گواہی دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ یہی طریق اب بھی تمام امت مسلمہ میں جاری ہے تاہم دوسری ترمیم کے بعد پاکستان میں مسلمان قرار پانے کے لئے نئی شرائط والے ایک حلف نامے پر دستخط ضروری ہیں اور یہاں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کا پڑھنا مسلمان ہونے کے لئے ناکافی قرار دیا گیا ہے اور یوں ان سب مسلمانوں کے اسلام کی نفی کر دی گئی ہے جو گزشتہ پندرہ سو سالوں میں صرف یہی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے۔ یہ جرأت اس لحاظ سے بھی قابل فکر ہے کہ قرآن کریم تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (مائدہ ۵:۴)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔

لیکن اس کے برخلاف اس فیصلہ کے کرنے والوں اور اس پر اصرار کرنے والوں کے نزدیک مسلمان ہونے کا طریق صدیوں بعد اس دوسری ترمیم کے ذریعہ طے ہوا۔ گویا سارے درمیانہ عرصہ میں اسلام نامکمل رہا؟

۷۔آں حضرت ﷺ کی ایک اور پیشگوئی کا ظہور:

دوسری ترمیم کے ذریعہ قرآن کریم اور آں حضرت ﷺ کی سنت کے بارے میں شکوک پیدا کرنے کی یہ کوشش ارباب اقتدار نے اپنے مفاد دیکھتے ہوئے اس گروہ کے مطالبہ پر اور اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے اسے اپنے ساتھ ملائے رکھنے کے لئے کی جس کا روزگار مذہب کے نام پر سیاست کرنا ہے گو ان پر علمائے دین کا لیبل لگا ہوا ہے۔ تنگ نظری، عدم رواداری اور تشدد ان کا طریق ہے اور حکومت کو دبائے رکھنے کے لئے جلسے، جلوس، مظاہرے اور فتوے جن کا ہتھیار ہے۔

ان علماء کے اس منفی کردار کو دیکھ کر ہر اہل نظر کی توجہ درج ذیل پیش خبریوں کی طرف جاتی ہے جو آں حضرت ﷺ نے اس زمانے کے ان مولویوں کے بارے میں فرمائی تھیں:

علماءهم شر من تحت اديم السماء من عندهم تخرج الفتنته و فيهم تعود (مشکوۃ کتاب العلم الفصل الثالث صفحہ ۳۸)

ترجمہ: ان کے علماء آسمان کے نیچے بسنے والی مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہوں گے ان ہی سے فتنے اٹھیں گے اور انہی میں لوٹ جائیں گے۔

تکون فی امتی فزعة فیصیر الناس الی علماءهم فاذاهم قردة و خنازیر (کنز العمال صفحہ ۱۹۰/۷)

ترجمہ: میری امت پر ایک زمانہ اضطراب و انتشار کا آئے گا لوگ اپنے علماء کے پاس رہنمائی کی امید سے جائیں گے تو وہ انہیں بندروں اور سؤروں کی طرح پائیں گے۔

۸۔توہینِ رسالت اور توہینِ قرآن:

مندرجہ بالا آیات اور احادیث کی روشنی میں اس دوسری ترمیم اور اس کے تحت شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لئے مجوزہ فارموں پر مسلمان ہونے کے حلف نامے خود اپنی ذات میں توہین رسالت بھی ہیں اور توہین قرآن بھی۔ پھر اس ترمیم کے تتبع میں ۱۹۸۴ء میں نافذ کئے جانے والے ظالمانہ قوانین اور ان پر عمل درآمد کے لئے خدا کے گھروں سے اللہ اور رسول کے نام کو بالجبر مٹانے اور بعض دفعہ اس عمل کی قانون کے نگہبانوں کو اپنی نگرانی میں جمعداروں کے ذریعہ سرانجام دہی اللہ اور رسول کے ناموں کی ایک شرمناک توہین ہے۔ اس فیصلہ کے بعد سے پاکستان پر خوف اور بدامنی کے گہرے سائے مسلط ہیں ہر روز اخبارات اندوہناک خبروں سے بھرے ہوتے ہیں ہر دن گزشتہ دن سے خراب چڑھتا ہے اور ہر میدان میں ملک مسلسل زوال پذیر ہوتا چلا جا رہا ہے کیا یہ سب اس توہین کے نتیجہ میں اترنے والا عذاب الٰہی نہیں؟

۹۔ماضی کی ناکام کوششوں کی مانند:

کسی اسمبلی کا اپنی حد سے تجاوز کر کے کسی مذہبی نقطہ نظر اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں دوسری ترمیم کی شکل کا فیصلہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا۔ مذہبی تاریخ میں پہلے بھی کئی بار قوموں کے بڑوں نے باہم اتفاق کر کے طاقت کے زعم میں اختلاف عقیدہ کے جرم میں چھوٹی جماعتوں کے خلاف سزا دہی کے فیصلہ کئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا فیصلہ نمرود کی مشاورتی مجلس کا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لٹکانے کا فیصلہ فلسطین میں قیصر کے نمائندوں نے کیا۔ آں حضرت ﷺ اور ان کے اصحاب کے معاشرتی بائیکاٹ اور شعب ابی طالب میں نظر بندی کا فیصلہ سرداران مکہ کی مجلس نے کیا اور ایسی ہی ایک مجلس نے ہجرت سے قبل آں حضرت ﷺ کو قتل کر دینے کے فیصلہ پر بھی جرأت کی۔ کمیٹیوں، جرگوں اور اسمبلیوں کے ان فیصلوں کے رد میں خدائی تقدیر کس طرح ظاہر ہوئی یہ بھی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آں حضرت ﷺ کی عظمتِ شان پر ان فیصلوں سے ذرہ برابر فرق نہ پڑا۔ ہاں نمرود اور اس کے ساتھی، یہودی فریسی اور سرداران قریش جس بدانجام سے دوچار ہوئے یہ سب کے سامنے ہے۔

پاکستان میں بھی دوسری ترمیم کا سہرا اپنے سر باندھنے والے اور اس پر عمل درآمد کے لئے ۱۹۸۴ء میں آرڈیننس نافذ کرنے والوں کا انجام اہل نظر کے لئے مقام عبرت ہے۔

۱۰۔مثبت پہلو:

اس دوسری ترمیم کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ اس ترمیم کی منظوری پر اخبارات میں یہ خبر اس اظہار کے ساتھ شائع ہوئی کہ امت کے بہتر فرقوں نے اتفاق رائے سے احمدیوں کے خلاف فیصلہ کر دیا ہے اور اس اتفاق پر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار بھی ہوا مثلاً اخبار نوائے

وقت نے زیرعنوان 'بہتر فرقوں کا اجماع' اپنی رائے کا اظہار کیا اور لکھا:

'اسلام کی تاریخ میں اس قدر پورے طور پر کسی اہم مسئلہ پر کبھی اجماع امت نہیں ہوا......... قادیانی فرقہ کو چھوڑ کر جو بھی ۷۲ فرقے مسلمانوں کے بتائے جاتے ہیں سب کے سب اس حل پر متفق اور خوش ہیں'۔ (نوائے وقت ۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

۷۲ اور ایک کی اس تعیین سے آں حضرت ﷺ کی ایک اور پیشگوئی پوری ہوگئی جس کے الفاظ یہ ہیں۔ 'ان بنی اسرائیل تفرقت علیٰ ثنتین و سبعین ملته و تفترق امتی علیٰ ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة. قالوا من هی یا رسول الله؟ قال: ما انا علیه و اصحابی (ترمذی کتاب الایمان ۲/۸۹)

ترجمہ: بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی لیکن ایک فرقہ کے سوا سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا یہ ناجی فرقہ کون سا ہے۔ تو حضور نے فرمایا وہ فرقہ جو میری اور میرے صحابہ کی سنت پر عمل پیرا ہو گا۔

اس پیشگوئی کی وضاحت میں مولوی مودودی صاحب نے لکھا تھا:

'اس حدیث میں اس جماعت کی دو علامتیں نمایاں طور پر بیان کر دی گئی ہیں ایک تو یہ وہ آں حضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہو گی اور دوسری یہ کہ نہایت اقلیت میں ہو گی۔' (ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷۶)

یہ بوالعجبی بہرحال اپنی جگہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے تو یہ فرمایا تھا کہ ۷۲ غلط ہوں گے اور ایک درست اور یہاں قوم کو اس بات سے بہلایا گیا ہے کہ ۷۲ صحیح ہیں اور ایک غلط!

❁❁❁

جب بندہ بوڑھا ہو جاتا ہے

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ماس - گجرات، پاکستان

جب بندہ ۶۰ یا ۶۵ سال سے اوپر پہنچتا ہے تو اسکی ہڈیوں میں بُھربُھراپن Osteoporosis کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں یہ عمل مزید کم عمر سے شروع ہوتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کے بارے آپ نے عام سُنا ہو گا کہ وہ گرے ہیں اور ان کی کولہے کی ہڈی Femur Head Fracture ٹوٹ گئی ہے۔ حالانکہ وہ کولہے کی ہڈی گرنے سے نہیں ٹوٹی ہوتی، بلکہ بوڑھا آدمی جب کھڑا ہوتا ہے تو اس کی ہڈیاں پہلے سے ہی Osteoporosis کی وجہ سے کمزور ہو چکی ہوتیں ہیں وہ ہڈیاں اس کا وزن نہیں سہار سکتی اور وہ کھڑے کھڑے ٹوٹ جاتیں ہیں اور بوڑھا شخص نیچے گر پڑتا ہے، ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اس کی ہڈی گرنے سے ٹوٹی ہے، حالانکہ وہ ہڈی ٹوٹنے کے بعد گرا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ واش روم جاتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ انکی جسم کی کوئی بھی ہڈی گرنے کے وجہ سے ٹوٹی ہے۔ حالانکہ ایسا عموماً نہیں ہوتا۔۔۔ اب آتے ہیں اس کے علاج کی طرف۔ پہلی سٹیج علاج کی ہے کہ ان کی ہڈیوں میں بُھربُھراپن Osteoporosis ہونے سے روکا جائے۔ اس کیلئے آپ انکو Calc carb CM کی ایک خوراک دیکر پھر اگلے دن سے Calc phos ۶x چار چار گولیاں صبح دوپہر شام کھانا کھانے کے پندرہ منٹ بعد ایک ماہ دیں۔ جب بندہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے اندر کیلشیم کو جزب کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے، یہ دوا Calc carb CM جسم میں کیلشیم کو جزب کرنے کی صلاحیت بڑھا دیتی ہے۔ انگریزی ڈاکٹر ایسے بوڑھوں کو Calcium Tablets کا بے دریغ استعمال کرواتے ہیں جس سے بوڑھوں لوگوں کے گردوں میں پتھریاں بن جاتیں ہیں۔ کیلشیم آپ ان کو جتنا مرضی دیں، یہ سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یہاں ھومیو پیتھک دوا کلکریا کارب سی ایم ان میں کیلشیم جذب کرنے میں بہت معاون ہے اور انتہائی اچھا رزلٹ ہے۔

اب آتے ہیں دوسری جانب جب بوڑھے شخص کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے، انگریزی ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اب اسکا آپریشن نہیں ہو سکتا کیونکہ مریض بہت کمزور ہے، یہ آپریشن کے کٹھن مراحل سے نہیں گزر سکتا۔ ایسی صورت میں اگر کولہے کی ہڈی ٹوٹی ہو تو پھر اس کو بستر پر ڈال کر اس کے پاؤں پر ایک اینٹ کے برابر وزن ڈال کر لٹکا دیا جاتا ہے، ایسا شخص درد سے قلبلاتا رہتا ہے۔ درد شدید ہوتا ہے، لیکن آپریشن نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں ایلوپیتھک ڈاکٹرز Diclofenac Sodium انجکیشن سے درد کو کنٹرول کرتے ہیں، لیکن یہ انجکیشن معدے اور گردوں کو متاثر کر دیتا ہے۔ گردوں میں Hydronephrosis اور معدے میں Ulcer پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص بستر پر پڑے پڑے کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اگر کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے تو پھر ھومیو پیتھک دوا ایسے بوڑھے شخص کو آپریشن سے بھی بچاتی ہے اور دنوں میں ہڈی کو جوڑ بھی دیتی ہے اور درد کو فوری کنٹرول کرتی ہے۔ اس کیلئے Symphytum MT کے بیس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈالکر صبح دوپہر شام کھانے کے بعد اور Calc flour ۶x اور Calc phos ۶x دونوں کی چار چار گولیاں کھانے سے پہلے صبح دوپہر شام استعمال کریں۔ یوں سمجھیں کہ یہ فارمولہ ھومیو پیتھک کا ہڈی جوڑ سیمنٹ Cement ہے۔ فوری اثر کرتا ہے اور بوڑھوں کو آپریشن سے انشاء اللہ بچا لیتا ہے۔ اب آتے ہیں درد کو کنٹرول کرنے کی طرف۔ یاد رکھیں، اگر شروع میں درد کو کنٹرول کر لیا جائے تو پھر بوڑھے لمبے عرصے تک علاج کروا لیتے ہیں ورنہ درد کی وجہ سے آپریشن کی طرف بھاگتے ہیں۔ بعض کی آپریشن کے دوران موت واقع ہو جاتی ہے۔ درد کیلئے Ruta، Arnica اور Hypericum تین ادویات کا نمبر ون ہے۔ یہ علامات کے مطابق استعمال ہوتیں ہیں۔ اس کیلئے آپ کے ہر سوال کا جواب دیا جائے گا۔۔۔۔۔

❁❁❁

اندرون لاہور کے کوتوال

پولیس کا وہ نظام جو دلی سلطنت سے لے کر انگریز دور تک جاری رہا

اندرون لاہور میں 'شاہی گزر گاہ' کہلائے جانے والی ڈیڑھ کلومیٹر طویل سڑک پر چند افراد خاکی رنگ کی وردی اور اونچے شملے والی پگڑی پہنے، ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے اور گھٹنوں تک لمبی پتلون کے بیلٹ کے ساتھ پانی کی بوتل لٹکائے گذشتہ چند روز سے گھوم رہے ہیں۔

اُن کا گشت اندرون لاہور میں 'دہلی دروازہ' سے شروع ہو کر 'کوتوالی' پر ختم ہوتا ہے۔ ڈیڑھ کلومیٹر طویل اس شاہی گزر گاہ پر مسجد وزیر خان، شاہی حمام اور سنہری مسجد سمیت کئی اہم تاریخی عمارتیں قائم ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مغل بادشاہ اپنے قلعے سے نکل کر اسی راستے سے ہوتے ہوئے شاہی حمام اور جمعہ کے دن سنہری مسجد نماز ادا کرنے کے لیے آتے تھے۔

گئے دور کی ثقافت کی بحالی کے لیے کوشاں والڈ سٹی آف لاہور اتھارٹی نے اِن اجنبی دِکھتے افراد کو 'کوتوال' کے طور پر متعارف کروایا ہے۔

اتھارٹی کی ڈپٹی ڈائریکٹر تانیہ قریشی کہتی ہیں کہ 'مقصد یہ ہے کہ ایسے کرداروں کو متعارف کروایا جائے جو مغل، سکھ اور برطانوی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اندرون لاہور نے یہ کردار مختلف ادوار میں دیکھے ہوئے ہیں۔ یہ کوتوال شاہی گزر گاہ پر گشت کرتے ہیں۔ یہ سیاحت کا مرکز ہے اور اس کا اصل ماضی بحال کرنا ہمارا مقصد ہے۔'

اگرچہ ان اجنبی نظر آنے والے کرداروں کو متعارف کروانے کا مقصد تو 'ماضی کی بحالی' ہے مگر سوشل میڈیا پر بہت سے ایسے صارفین ہیں جو یہ کہتے ہوئے اس اقدام پر تنقید کر رہے ہیں کہ 'کوتوال برطانوی ظالمانہ دور کا نمائندہ کردار ہے۔'

ضیاالرحمٰن نامی ایک صارف کا کہنا ہے کہ 'انگریز سامراج کب کا ختم ہو چُکا، لیکن غُلامانہ سوچ ابھی بھی نہیں بدلی۔ نہ جانے یہ ذہنی غُلامی کب ختم ہو گی اور کب ہم انگریز اور انگریزی دونوں کے سحر سے باہر آئیں گے۔' جبکہ ایک اور صارف یوں گویا ہوئے 'یہ لباس ہزاروں شہیدوں کی توہین ہے جو جنگ آزادی سے لے کر قیام پاکستان تک شہید ہوئے۔'

مگر کوتوال کے کردار کو متعارف کروانے والی والڈ سٹی آف لاہور اتھارٹی کے سربراہ کامران لاشاری کا ماننا ہے کہ 'لاہور کا آدھا حصہ غلامی کی یاد ہے۔ مال روڈ پر تمام عمارتیں، تمام ادارے اُسی دور کی یاد ہیں۔ ہم کوئی کلچر تو بدلنے نہیں جا رہے۔ دنیا بھر میں کہیں بھی جائیں سیاحتی مقامات پر پرانے دور کا عکس ملتا ہے جس سے آپ کو تاریخ اور ثقافت سے واقفیت ملتی ہے۔' اب یہ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے کہ آیا یہ اقدام ہمیں 'ماضی کی یادوں سے جوڑنے' میں مدد فراہم کرے گا یا یہ 'غلامانہ سوچ کا عکاس' ہے مگر ہم آپ کو یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ 'کوتوال' کا عہدہ اصل میں تھا کیا اور اِس منصب پر فائز شخص کتنا طاقتور اور اہم گردانا جاتا تھا، کوتوال تعینات کرنے کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کب ختم۔

کوتوال کا لفظ کہاں سے آیا؟

معروف ضرب المثل 'سیّاں بھئے کوتوال اَب ڈَر کاہے کا' اس موقع پر بولا جاتا ہے جب آپ کا کوئی قریبی عزیز یا جاننے والا کسی بااختیار عہدے پر فائز ہو۔ اس ضرب المثل سے کوتوال کے عہدہ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ ۱۷ویں صدی کی لغت 'برہان قاطع' میں کوتوال کی تعریف قلعے اور شہر کے نگہبان کے طور پر کی گئی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں لفظ کوتوال ہندی الاصل ہے، جسے ہندی لفظ کوٹ (قلعہ) کی وجہ سے فارسی بولنے والوں نے اپنایا۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد اپنی کتاب 'ہندوستان میں مسلم حکم رانی کی مختصر تاریخ' میں لکھتے ہیں کہ 'کوتوال کے فرائض آئین اکبری میں مفصل بیان کیے گئے ہیں۔ وہ شہر کا پولیس افسر تھا جو بعض معاملات میں عدالتی اختیارات بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ شہروں میں امن عامہ کا ذمہ دار تھا اور جس کے ماتحت بہت سے معاون تھے۔ کوتوال کی ذمہ داری تھی کہ وہ قانون شکن افراد کو عدالت میں لائے تاکہ مقدمہ کی فوری کارروائی ہو سکے۔'

آئین اکبری کے مطابق جب شاہی دربار لگا ہوتا تھا تب کوتوال کو بھی دربار میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ وہ روزانہ شہر کی سرگرمیوں کی معلومات چوکیداروں اور اپنے مخبروں کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔ ضلع کی سطح پر کوتوال کا تقرر مرکزی حکومت کرتی تھی جبکہ ہر صوبے کے دارالحکومت اور اہم شہروں میں بھی مرکزی حکومت کوتوال کا تقرر کرتی تھی۔

کوتوال کے فرائض منصبی کیا تھے؟

کوتوال کی ذمہ داریاں کچھ یوں تھیں: امن وامان برقرار رکھنا، رات کو پہرے کا انتظام کرنا اور اجنبیوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا، چوروں اور ڈاکوؤں کو پکڑنا، لوہاروں پر نظر رکھنا کہ وہ چوروں کے لیے تالوں کی چابیاں نہ بنائیں، تفریحی مقامات اور میلوں میں جیب کتروں کو پکڑنا، خانہ بدوشوں کو خبر رسانی کے لیے بھرتی کرنا اور ان سے نزدیکی علاقوں کے اُمور اور عوام کے مختلف طبقات کی آمدنی اور اخراجات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔

ان کی ذمہ داریاں یہ بھی تھیں کہ گھروں، سڑکوں، شہریوں اور اجنبیوں کے بارے میں باقاعدہ معلومات رکھنا اور رجسٹروں میں اندراج کرنا، لاوارث مرحومین کی جائیداد کے بارے میں کوائف کا اندراج کرنا اور انھیں اپنی تحویل میں لینا، بھینسوں، بیلوں، گھوڑوں اور اونٹوں کو ذبح کرنے سے روکنا، عورتوں کو ان کی مرضی کے بغیر ستی ہونے سے روکنا، قیمتوں پر کنٹرول رکھنا، معاشرتی برائیوں کو روکنا، طوائفوں، رقاصاؤں، شراب اور نشہ آور اشیا فروخت کرنے والوں کو پکڑنا، ہر محلہ میں تعینات پیادوں سے محلہ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں رپورٹ لینا، پہرے داروں، خاکروبوں اور پیادوں سے حاصل شدہ رپورٹوں کا تقابل کرنا اور زمینی صورت حال سے باخبر رہنا اور ضروری ہو تو مناسب

کارروائی کرنا۔ ماہر سیاسیات آر پی پانڈے کے مطابق مغل دور میں کوتوال امن عامہ کے قیام کے ساتھ ساتھ بعض مقدمات بھی سُنتے تھے مگر قاضی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ دہلی میں پولیس نظام کی شروعات تقریباً آٹھ سو سال پرانی تصور کی جاتی ہیں۔ اس وقت دہلی کی سیکورٹی اور نظامِ قانون کی ذمہ داری کوتوال کی ہوا کرتی تھی۔

دہلی کے پہلے کوتوال

دہلی کے پہلے کوتوال ملک الامراء فخرالدین تھے۔ وہ سنہ ۱۲۳۷ میں ۴۰ سال کی عمر میں کوتوال بنے۔ اپنی ایمان داری کے سبب وہ تین سلطانوں کے دور میں طویل عرصہ تک اس عہدہ پر رہے۔ ایک بار ترکی کے کچھ امرا کی ملکیت سلطان بلبن کے حکم سے ضبط کرلی گئی۔ ان لوگوں نے سلطان کے حکم کو بدلنے کے لیے کوتوال فخرالدین کو رشوت کی پیشکش کی۔ کوتوال نے کہا کہ 'اگر میں رشوت لے لوں گا تو میری بات کا کوئی وزن نہیں رہ جائے گا۔' مغل بادشاہ شاہجہاں نے ۱۶۴۸ میں دہلی کو اپنا دارالحکومت بنانے کے ساتھ ہی غضنفر خان کو نئے شہر شاہجہان آباد کا پہلا کوتوال مقرر کیا تھا۔ غضنفر خان کو بعد میں کوتوال کے ساتھ ہی میر آتش (چیف آف آرٹیلری) بھی بنا دیا گیا۔ بعد کے ادوار میں شاید یہ معیار بدل گیا تھا۔ اُردو شاعر مرزا محمد رفیع سودا نے تہذیبی و معاشرتی انتشار پر ہجو 'شیدی فولاد خان کوتوال' کے عنوان سے لکھی ہے۔ سودا نے تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۷۸۱ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ فولاد خان کوتوال کی ہجو میں سودا نے اپنے زمانے کے انتشار اور طوائف الملوکی کا نقشہ بہت عمدہ کھینچا ہے۔ 'بدقماش چور اُچکے یہاں تک نڈر اور آزاد ہوگئے ہیں کہ کوتوال اُن کی خوشامد کرتا ہے۔ اور وہ خود کوتوال کی پگڑی کی قیمت لگاتے ہیں۔ فولاد خان شہر کی چوریوں میں چوروں کے ساتھ شریک رہتا ہے۔' چنانچہ بادشاہ کو جب اس کی خبر ملی تو فولاد خان اور اس کا بیٹا عتیق اللہ خان گرفتار ہوئے۔ سودا نے اس صورت حال پر یہ ہجو لکھی۔

ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے — اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بازو کا مفسروں کے زور ہے یہ — چور کا بھائی گھٹی چور ہے یہ

فولاد خان چوروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

سن لو چورو یہ مختصر قصہ — صبح کو بھیج دیجیو حصہ

'مرزا نوشہ اور چودھویں' میں سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں کہ 'سنہ ۱۲۶۴ (ہجری) میں مرزا غالب چوسر کی بدولت قید ہوئے۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک فارسی خط میں مرزا لکھتے ہیں' کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجود یکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم تھا، میرے معاملے میں کوتوال کا ماتحت بن گیا۔ اور میری قید کا حکم سنا دیا۔'

کوتوال نظام کا خاتمہ

سنہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور اسی کے ساتھ کوتوال نظام بھی ختم ہوگیا اور باقاعدہ پولیس کا نظام متعارف کروایا گیا۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دور میں اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کے دادا پنڈت گنگادھر نہرو دہلی کے آخری کوتوال تھے۔ انگریزوں نے دہلی میں قتل عام کیا تو گنگادھر نہرو اپنی اہلیہ جیورانی اور چار بیٹوں کے ساتھ آگرہ چلے گئے۔ فروری ۱۸۶۱ میں وہیں ان کی وفات ہوئی۔ اگرچہ جنگ آزادی کے بعد اصل مفہوم میں کوتوال کا عہدہ اور اختیارات تو ختم ہوگئے مگر یہ لفظ' کوتوال (شہر کے پولیس سربراہ کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ اسی لیے بعد میں آنے والی لغات میں کوتوال کے معانی یہ بھی بتائے گئے ہیں: 'پولیس کا افسر جس کے تحت شہر کا بڑا تھانہ ہو۔' محقق ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے مطابق 'انگریز دور میں بیرون شہر نئی کوتوالی تعمیر کرنے کا سوچا گیا۔ اُس زمانے میں شہر لاہور کے کوتوال میاں غلام رسول مرحوم تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سکاٹ تھے۔ پرانی کوتوالی کی عمارت کو نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ گرا دیا گیا اور بیرون دہلی دروازہ کوتوالی کی نئی عمارت تعمیر ہوئی۔ میں اس زمانے میں نجی طور پر کوتوال شہر میاں غلام رسول کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔'

'انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کوتوالی کی نئی عمارت میں سنگ مرمر کی ایک تختی لگائی جائے انھوں نے مجھے بتایا کہ خود انھوں نے مطلوبہ اردو اشعار تو لکھ لیے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں علامہ اقبال سے بھی مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ میاں صاحب علامہ کے انارکلی والے مکان میں وہ اشعار لے کر گئے جن میں علامہ نے اصلاح بھی دی اور ان اشعار کا عنوان عمارت فرخ فرجام تجویز فرمایا اور یہ تاریخی عنوان تھا کیونکہ ان الفاظ سے عمارت کی تاریخ تعمیر ۱۹۱۵ء نکلتی تھی افسوس آج نہ وہاں سنگ مرمر کی وہ تختی ہے اور نہ یہ تاریخی نام۔'

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں لاہور کے آخری کوتوال (۱۸۳۵-۱۸۴۰) سردار جے مل سنگھ تھے۔ انگریز دور میں لاہور کے پہلے کوتوال خدا بخش تھے۔ وہ ککے زئی قوم کے تھے۔ انھیں انگریز سپاہیوں سے شاہی قلعہ کے توشہ خانہ سے چوری شدہ قیمتی اشیا برآمد کرنے پر پانچ ہزار روپے اور ۵۰ تولہ سونا انعام میں دیے گئے۔ پھر چودھری رحمت اللہ کے ۱۹۰۱ میں کوتوال ہونے کا ایک تصویر سے پتہ چلتا ہے۔

محقق ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے مطابق 'انگریز دور میں بیرون شہر نئی کوتوالی تعمیر کرنے کا سوچا گیا۔ اُس زمانے میں شہر لاہور کے کوتوال میاں غلام رسول مرحوم تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سکاٹ تھے۔ پرانی کوتوالی کی عمارت کو نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ گرا دیا گیا اور بیرون دہلی دروازہ کوتوالی کی نئی عمارت تعمیر ہوئی۔ میں اس زمانے میں نجی طور پر کوتوال شہر میاں غلام رسول کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔'

'انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کوتوالی کی نئی عمارت میں سنگ مرمر کی ایک تختی لگائی جائے انھوں نے مجھے بتایا کہ خود انھوں نے مطلوبہ اردو اشعار تو لکھ لیے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں علامہ اقبال سے بھی مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ میاں صاحب علامہ کے انارکلی والے مکان میں وہ اشعار لے کر گئے جن میں علامہ نے اصلاح بھی دی اور ان اشعار کا عنوان عمارت فرخ فرجام تجویز فرمایا اور یہ تاریخی عنوان تھا کیونکہ ان الفاظ سے عمارت کی تاریخ تعمیر ۱۹۱۵ء نکلتی تھی افسوس آج نہ وہاں سنگ مرمر کی وہ تختی ہے اور نہ یہ تاریخی نام۔'

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں لاہور کے آخری کوتوال (۱۸۳۵-۱۸۴۰) سردار جے مل سنگھ تھے۔ انگریز دور میں لاہور کے پہلے کوتوال خدا بخش تھے۔ وہ ککے زئی قوم کے تھے۔ انھیں انگریز سپاہیوں سے شاہی قلعہ کے توشہ خانہ سے چوری شدہ قیمتی اشیا برآمد کرنے پر پانچ ہزار روپے اور ۵۰ تولہ سونا انعام میں دیے گئے۔ پھر چودھری رحمت اللہ کے ۱۹۰۱ میں کوتوال ہونے کا ایک تصویر سے پتہ چلتا ہے۔

شعبہ پاکستان

میڈیا مارشل لا کی تیاری

تحریر: مظہر عباس

محترم وزیر اطلاعات فواد چوہدری ان دنوں بڑے زور و شور سے 'میڈیا ڈویلپمنٹ اتھارٹی' قائم کرنے کیلئے سرگرم ہیں۔ کل تک اپنے آپ کو خود صحافی اور اینکر کہنے والے آج ان لوگوں کو نہیں پہچان پا رہے جنہیں وہ کل تک صحافی مانتے تھے۔

وہ PFUJ جیسی تنظیم کو بھی میڈیا مالکان سے جوڑ رہے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ۱۹۵۰ سے تاریخ کیا رہی ہے اور اس نے صحافتی تاریخ کی سب سے بڑی ہڑتال مالکان کے خلاف ہی کی تھی۔ ۱۹۷۰ میں ہم کمزور ضرور ہوئے ہیں اور آپ جیسے حکمرانوں نے ہمیں توڑا بھی ہے مگر یاد رکھیں آج بھی کچھ دیوانے سڑکوں پر ہیں، آزادی صحافت کے تحفظ کیلئے۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ اس اتھارٹی کے قیام کے بعد پہلے میڈیا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ الطاف گوہر اور جنرل مجیب کی صف میں ہوں گے یا جمہوریت پسندوں کی فہرست میں رہنا پسند کریں گے۔ میڈیائی مارشل لا کے خلاف لڑائی دلیل سے بھی ہوگی اور احتجاج سے بھی۔ رہ گئی بات 'فیک نیوز' کی تو اس کے موجد تو خود حکمران ہیں۔ بیانات اٹھالیں اور تجزیہ کرتے چلے جائیں۔ جہاں تک قانون کی بات ہے تو وزیر اعظم عمران خان اکثر اس حوالے سے برطانیہ کی مثال دیتے ہیں۔ آپ اس ملک میں صرف ہتک عزت کا قانون سخت کر دیں۔ ۲۰۰۲ کے قانون میں ترمیم کر دیں فرق خود محسوس کریں گے۔ اگر پرنٹ، الیکٹرونک اور ڈیجیٹل میڈیا کو حکمرانی کے زیر اثر لانا ہے تو یہ کوشش تو آپ سے پہلے والوں نے بھی کی تھی آپ بھی کر لیں۔ اس میڈیا اتھارٹی کے جو خدوخال آپ نے بیان کئے ہیں، اس سے ایوب خان کے ۱۹۶۰ کے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ وہ صرف پرنٹ میڈیا کے لئے تھا اور اخبارات پر دباؤ اور کنٹرول کے لئے PMDA کے ذریعے آپ ہر طرح کے میڈیا کو قابو کرنا چاہتے ہیں جہاں پہلے ہی بہت سے قوانین ہیں۔ میڈیا پر دباؤ ڈالنے کے لئے ایک اور قانون سہی مگر یاد رکھیں کہ اطلاعات کی اس دنیا میں 'خبر' رکتی نہیں ہے۔ سنسر شپ اور کنٹرول ہی 'فیک نیوز' اور افواہوں کو جنم دیتا ہے۔ جن قوانین کو ختم کیا جارہا ہے، ان میں اخباری کارکنوں کی طویل جدوجہد سے بنایا جانے والا نیوز پیپر ایمپلائز ایکٹ ۱۹۷۳ بھی شامل ہے جو نہ صرف صحافیوں اور کارکنوں کی تنخواہوں کا تعین کرتا ہے بلکہ تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے مالکان کئی بار سپریم کورٹ گئے مگر ناکام ہوئے، اب یہ کام فواد چوہدری صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس میں ترمیم کرکے الیکٹرونک میڈیا کے ملازمین کو بھی تحفظ دیا جائے۔ دوسرا قانون جو ختم کیا جارہا ہے، وہ پاکستان الیکٹرونک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) ہے۔ یہ قانون ٹی وی چینلز کو لائسنس دینے اور ریگولیٹ کرنے کیلئے لایا گیا تھا۔ اس میں حکومتی اور ریاستی مداخلتیں نہ ہوں تو اسے بھی بہتر کیا جاسکتا ہے۔

ویسے جب یہ قانون بن رہا تھا تو PFUJ نے کراس میڈیا اونر شپ کی مخالفت کی تھی کیوں کہ خدشہ تھا کہ اجارہ داریاں قائم ہوں گی مگر شیخ رشید احمد اور فواد صاحب جیسے لوگ اس کے حق میں تھے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جب ۲۰۱۴ میں مسلم لیگ کی حکومت میں انسدادِ الیکٹرانک کرائمز ایکٹ بنا تو PFUJ نے خبردار کیا کہ اس کا غلط استعمال ہوسکتا ہے۔ آج اسے FIA کے ذریعے ہراساں کرنے کیلئے استعمال کیا جارہا ہے مگر اسے ختم نہیں کیا جارہا۔

اس اتھارٹی کے بعد پریس کونسل آف پاکستان ایکٹ ۲۰۰۲ بھی ختم ہوجائے گا۔ ویسے تو پچھلے تین سال سے اس کا چیئرمین مقرر نہ کر کے حکومت نے اس کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب صرف ضابطے کی کارروائی باقی ہے۔ سو بسم اللہ کیجئے۔ اس اتھارٹی کے قیام کے بعد نیوز ایجنسی اینڈ بک رجسٹریشن آرڈیننس ۲۰۰۲ اور موشن پیکچر آرڈیننس ۱۹۷۹ بھی ختم ہو جائے گا۔ ''پھر سب اچھی کتابیں اور فلمیں بنیں گی۔'' بس آپ سب کو لائسنس اور رجسٹریشن کیلئے دربار میں حاضری دینی ہوگی۔ اب اگر کسی کو 'جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق' کہنے کی بری عادت پڑی ہوئی ہے تو ایسے لوگوں کے لئے صحافت کا خاتمہ سمجھیں۔ اس سب کے بعد میڈیا کا حال کیا ہوگا؟ اس کی نشاندہی بہت پہلے محسن بھوپالی مرحوم نے ضیاء کی سنسر شپ کے زمانے میں کر دی تھی۔

ابلاغ کے لئے نہ تم اخبار دیکھنا
ہو جستجو تو کوچہ و بازار دیکھنا
ایسا نہ ہو کہ حشر میں وجہ سزا بنے
نقشے میں اک شبیہ کا چھ بار دیکھنا
تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج
راہ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح آزادی صحافت کے علمبردار تھے مگر ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو خود ان کی تقریر سنسر کرنے کی سازش ڈان کے مدیر الطاف حسین نے ناکام بنادی۔

آج کے وزیر اطلاعات جناح کے اخبار پر بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ ہونے کا الزام لگا رہے ہیں۔ ثبوت ہے تو عدالت جائیں، 'فیک نیوز' کیوں پھیلا رہے ہیں۔ ملک ٹوٹ رہا تھا اور کہا گیا لکھوں کہ سب ٹھیک ہے۔ اسی مائنڈ سیٹ نے صحافیوں کو گرفتار کرایا۔ میڈیا پر پابندیاں لگوائیں صحافی گمشدہ ہوئے، بہت سے مارے گئے اور کچھ کو چینل سے ہٹادیا گیا اور ان کے کالم رکوادیئے گئے۔ پھر کہا جاتا ہے ثبوت لاؤ۔ اب مائنڈ سیٹ یا سوچ کا بھی کوئی ثبوت ہوتا ہے وہ تو عمل سے پتا چل جاتا ہے، بس ایک فون کال کافی ہے۔ ہمارے پاس قلم ہے، مائیک ہے اور زبان ہے، آپ کے پاس طاقت ہے اس سب کو بند کرنے کی۔ ہمارے پاس نثار عثمانی اور منہاج برنا کی میراث ہے۔ آپ کے پاس ایوب، ضیاء اور مشرف کی میراث ہے۔ تاریخ ایسے ہی آپ کو یاد رکھے گی۔ ❁❁❁

شعبہ پاکستان

سرسید احمد خان، انگلش میڈیم اور لبرل طبقہ

تحریر: ڈاکٹر شوکت علی

جب سے وزیر اعظم نے انگلش میڈیم نظام تعلیم کو ذہنی غلامی سے تعبیر کیا ہے پاکستان میں ایک مخصوص طبقے نے انہیں نشانے پر رکھ لیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ قائد اعظم بھی تو انگلش میڈیم اداروں کے تعلیم یافتہ تھے، وہ تو ذہنی غلام نہیں تھے۔ کوئی سرسید احمد خاں کا حوالہ دیتا ہے اور علی گڑھ کالج کی بات کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

مملکت خداداد پاکستان میں قائد اعظم کس طرح کا تعلیمی نظام چاہتے تھے، اس بات سے تو زیادہ تر لوگ واقف ہی ہوں گے۔ البتہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ سرسید احمد خاں بھی اردو ذریعہ تعلیم کے حامی تھے سرسید زندگی بھر اس بات کے قائل رہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر، ہندوستان کے عام باشندوں کی تعلیم کا ہدف حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۶۷ میں سرسید نے وائسرائے ہند کو ایک خط لکھا۔ خط میں سرسید نے ایک ایسے تعلیمی ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی جہاں کلکتہ یونیورسٹی میں رائج انگریزی نصاب کو، اردو میڈیم میں پڑھانے کا بندوبست ہو۔ خط کے آخر میں سرسید نے انگریزی نصاب کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔

انگریز حکومت نے اس تجویز کو بخوشی قبول کرلیا اور اردو میڈیم یونیوسٹی کے قیام کے لیے خط و کتابت کا آغاز ہوگیا۔ لیکن بعد ازاں سرسید اپنی ہی اس تجویز کے خلاف ہوگئے۔ دراصل سرسید چاہتے تھے کہ اردو میڈیم کا نظام، انگلش میڈیم کے متوازی قائم کیا جائے، جبکہ اُدھر، سرسید کو بھنک پڑ گئی تھی کہ برطانوی حکومت، کلکتہ یونیورسٹی میں رائج انگلش میڈیم کو معطل کر کے اردو میڈیم کا آغاز چاہتی ہے۔ ہندوستان میں انگلش میڈیم کی معطلی، سرسید کو ہرگز گوارا نہیں تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ ہند میں انگلش میڈیم کو معطل کیا جائے۔

بعد ازاں جلسوں میں خطاب کرتے ہوئے سرسید نے وضاحت کی کہ وائسرائے اُن کے خط کا مدعا و منشا نہیں سمجھ سکے سرسید ان جلسوں میں علی الاعلان کہتے تھے کہ وہ انگلش میڈیم کے متوازی ایک دوسرا تعلیمی نظام چاہتے ہیں، جہاں جدید تعلیم اردو میڈیم میں دی جاسکے۔

اگر واقعی ایسا تھا تو پھر کیا سرسید، ہندوستان میں طبقاتی نظام تعلیم کے حامی تھے؟

اس سوال کا جواب سرسید احمد کے اس بیان سے ازخود واضح ہوجاتا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۲ میں قائم کردہ برطانوی ایجوکیشن کمیشن میں ریکارڈ کروایا۔ کمیشن کے روبرو بات کرتے ہوئے سرسید نے وضاحت کی کہ وہ دو طرح کے الگ الگ تعلیمی نظام چاہتے ہیں۔ بقول سرسید احمد، ایسے پرائمری یا مڈل اسکول جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا نہیں ہے، وہاں مغربی علوم کے لیے اردو میڈیم کو اپنانا زیادہ بہتر ہے۔ مگر وہ اسکول جن کا مقصد طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا ہو وہاں اردو میڈیم کے بجائے انگلش میڈیم کو اپنایا جائے۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے طبقاتی نظام تعلیم کی وکالت کر کے سرسید آخر کون سے اہداف حاصل کرنا چاہتے تھے؟ جب تک آپ اس بنیادی سوال کو نہیں سمجھیں گے، آپ نہ ہی سرسید کے تعلیمی نظریات کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی برصغیر کے موجودہ تعلیمی المیے کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ سرسید احمد خاں ۱۸۳۸ میں ۲۲ سال کی عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک معمولی ملازم (کلرک) کے طور پر بھرتی ہوئے۔ بعد ازاں امین (افسر مالیہ جو رعایا کی اجناس وغیرہ پر ٹیکس کا تعین کرتا ہے)، صدر امین (امینوں کا افسر)، صدر الصدور (خیرات و اوقاف کا ذمے دار افسر) اور بالآخر ۱۸۶۷ کو ترقی پا کر اسمال کاز کورٹ (معمولی تنازعات کے لیے چھوٹی عدالت) کے جج مقرر ہوئے۔ تقریباً ۳۸ سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کی ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۷۶ کو ریٹائر ہوئے۔ سرسید انگریزوں کی نظر میں ایک قابل اعتماد اور وفادار ماتحت تھے۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں بھی سرسید انگریزوں کے طرف دار اور وفادار رہے۔ صلے میں انعام کے طور پر نقد رقم کے علاوہ دو نسلوں تک معقول پینشن قبول کی۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں سرسید، ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف لڑنے والی ریاستوں اور گروہوں کا دم خم دیکھ چکے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات پختہ ہوچکی تھی کہ اب انگریزوں کی حکومت مستحکم ہے اور کوئی ان کی طاقت کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ سرسید کے نزدیک مصلحت یہی تھی کہ انگریزوں کی حکمرانی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ اور برطانوی حکومت کو اپنی وفاداری و اطاعت کا یقین دلا کر ہندوستانیوں کے لیے جس قدر ہوسکیں مراعات حاصل کی جائیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد ازاں برطانوی حکومت کی ماتحتی میں رہ کر، سرسید احمد خاں، انگریز افسروں کی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کا مشاہدہ کرتے چلے آرہے تھے۔ برطانوی حکومت، انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر بیک جنبش قلم نافذ کر چکی تھی سرسید دیکھ رہے تھے کہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں مشرقی علوم حاصل کر کے نچلے درجے کی ملازمت تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن برطانوی حکومت میں اعلیٰ عہدے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ وہ اس بات کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ انگریزوں کے ہوتے ہوئے اعلیٰ برطانوی افسروں کے ہاں انگریزی زبان کی ہی حکمرانی رہے گی اور ہندوستان کی مقامی زبانیں یہاں پھٹکنے بھی نہیں پائیں گی۔ ان حالات نے سرسید کو حریت پسند کے بجائے ایک مصلحت پسند اور انگریز پسند شخصیت بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تادم مرگ انگریزوں کے طرف دار اور وفادار رہے۔ انگریز بھی، ہندوستان میں برطانوسی حکومت کے استحکام کے لیے سرسید کی جاں نثاری اور بیش بہا کوششوں کو سراہتے تھے۔ یہاں تک کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی سرسید کو ہند کی قانون ساز کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا۔ سرسید الیکشن کے ذریعے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کی نامزدگی سے کونسل کے ممبر ہوئے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرسید کو انگریزی برائے نام آتی تھی اور قانون ساز کونسل کے اجلاسوں میں شرکت کرتے ہوئے انہیں اپنی اس کمزوری کا شدت سے احساس رہتا تھا، اور وہ اس کمزوری کو ندامت کی حد تک محسوس کرتے تھے۔

میری رائے میں سرسید کے یہی وہ احساسات تھے جن میں سرسید کے تمام تر سیاسی و تعلیمی نظریات کی جڑیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ بغور جائزہ لیا جائے تو سرسید کے تعلیمی نظریات

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل

کی جڑیں، مصلحت پسندی اور انگریز پسندی میں ہی پیوست نظر آتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سرسید احمد خاں برطانوی ہندوستان میں طبقاتی نظام تعلیم کی حمایت کرتے تھے۔ اس طبقاتی نظام تعلیم سے سرسید اپنے تئیں دو طرح کے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلا مقصد، ہندوستان کے کروڑوں عام باشندوں کی تعلیم اور دوسرا مقصد ہندوستانیوں کے مخصوص طبقے کا برطانوی حکومت میں اعلیٰ عہدوں کا حصول۔

ہندوستانیوں کے کروڑوں عام باشندوں کی تعلیم کے حوالے سے سرسید کا خیال تھا کہ یہ مقصد اردو میڈیم وغیرہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام باشندوں کی تعلیم کے لیے اردو میڈیم کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن انگلش میڈیم کے لیے وہ کس طرح کے دلائل پیش کرتے تھے، اس بات کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں سرسید کا تعلیمی نظریہ یہ تھا کہ جب کسی قوم (جیسا کہ ہند کے مسلمان) میں حکومت نہ رہے تو اس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم (یعنی برطانوی) کے علوم و زبان حاصل کر کے ملکی حکومت میں حصہ لے۔ سرسید مثال دے کر سمجھاتے تھے کہ جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو ہند کے باشندوں میں سے وہی لوگ حکومت میں شریک ہوئے جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے سے خیالات، اُن کا سا تمدن، اُن کا سا لب و لہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ سرسید کی منطق یہ تھی کہ حکمرانوں کی زبان میں علم حاصل کیے بغیر کوئی بھی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اور چونکہ ہندوستان کے حکمران انگریز ہیں اس لیے اس ملک میں اردو کے ذریعے سے ترقی کا ہونا محال ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں، سرسید کے نزدیک ترقی کا مفہوم یہی تھا کہ ہندوستانی باشندے، انگلش میڈیم کے ذریعے، برطانوی حکومت میں اعلیٰ ملازمتیں حاصل کریں اور پھر انہی ملازمتوں کی بدولت عزت و تکریم پائیں۔ چونکہ برطانوی راج میں انجینئرنگ کا سرٹیفکیٹ، ڈاکٹری کا ڈپلومہ، بیرسٹری کی سند، انڈین سول سروس میں شمولیت، ہائی کورٹ کی ججی، اور قانون ساز کونسل کی ممبری جیسے اعلیٰ عہدے انگلش میڈیم کے بغیر حاصل نہیں کیے جاسکتے تھے، اس لیے سرسید انگلش میڈیم کے وکیل بن گئے۔ سرسید کے نزدیک انگریزوں کی غلامی سے نجات کا راستہ بھی انگلش میڈیم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ لیکن سرسید غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اُس طریقے کے قائل نہیں تھے جو بعد میں کانگریس یا قائداعظم محمد علی جناح کی مسلم لیگ نے اختیار کیا۔ سرسید انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے بھی ایک مختلف اور منفرد طریقے کے قائل تھے۔ سرسید کا طریقہ یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ انگریزی تعلیم حاصل کریں اور اپنے آپ کو انگریزوں کے رنگ میں اس قدر رنگ لیں کہ برطانوی حکمران انہیں اعلیٰ عہدوں کے لیے قبول کرلیں۔ اس طرح جب زیادہ سے زیادہ ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے لیے منتخب ہونا شروع ہوجائیں گے تو پھر غلامی کا تعلق آپ سے آپ ہی دوستی میں بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو اپنی کھوئی ہوئی عزت و حشمت واپس مل جائے گی۔ انگلش میڈیم تعلیم کی بدولت ہندوستان کے غلام باشندے برطانوی حکومت کے نظروں میں کس قدر معتبر ٹھہرے یہ ایک الگ بحث ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ چیدہ چیدہ سرکاری عہدوں پر دیسی افسر نظر آنے لگے۔ اور بعد ازاں تقسیم ہند کے بعد یہی دیسی افسر پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں ارباب اختیار ٹھہرے۔ برطانوی انگلش میڈیم اداروں کے تربیت یافتہ دیسی افسر یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ اب وہ ایک غلام ہندوستان نہیں بلکہ آزاد ملک کے باشندے ہیں۔ یہ لوگ آزاد پاکستان میں بھی ویسا ہی سوچتے رہے جیسا کہ غلام ہندوستان میں سرسید احمد خاں سوچا کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے حمایت یافتہ انگریزی میڈیم اداروں کے دانشوروں کا بااثر گروہ، سرسید کی یہ بات بھول گیا کہ عوامی تعلیم کا مقصد اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بااثر لوگ اس بات کا ادراک ہی نہیں کر پائے کہ ایک مخصوص طبقے کو کاروبار مملکت میں شامل کرنے کے لیے سرسید کے طبقاتی نظام تعلیم کا فلسفہ (اگر یہ درست بھی تھا) تو آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی غیر متعلق ہو چکا ہے۔ اور اب ایک خوددار اور آزاد پاکستان میں مقامی زبان اردو کو ہر سطح پر سرکاری و تعلیمی زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہر خاص و عام کو کاروبار مملکت میں شامل ہونے کا برابر موقع ملے۔ لیکن افسوس کہ سرسید احمد خاں کے وہ مصلحت پسندانہ اور انگریز پسندانہ، تعلیمی نظریات، جو غلام ہندوستان میں غلامی کو بطریقِ احسن نبھانے کے لیے وضع کیے گئے تھے، ایک آزاد، خود مختار، مملکت خداداد، اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی قائداعظم کی وفات کے بعد جاری کر دیے گئے۔ سرسید احمد خاں مصلحت پسند تھے، اصلاح پسند تھے، انقلابی تھے، کیا تھے؟ میں اس پر رائے زنی سے اجتناب کروں گا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ سرسید کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہوگا کہ غلام ہندوستان میں جس طبقاتی تعلیمی نظام کا بیج وہ بونے جارہے ہیں ڈیڑھ سو سال بعد بھی برصغیر کے باشندے اس سے جان نہیں چھڑا پائیں گے۔ اور بقول الطاف حسین حالی (سرسید کے معتقد اور قریبی ساتھی) سرسید کو عمر بھر کے تجربے سے اس قدر ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہوسکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

❀❀❀

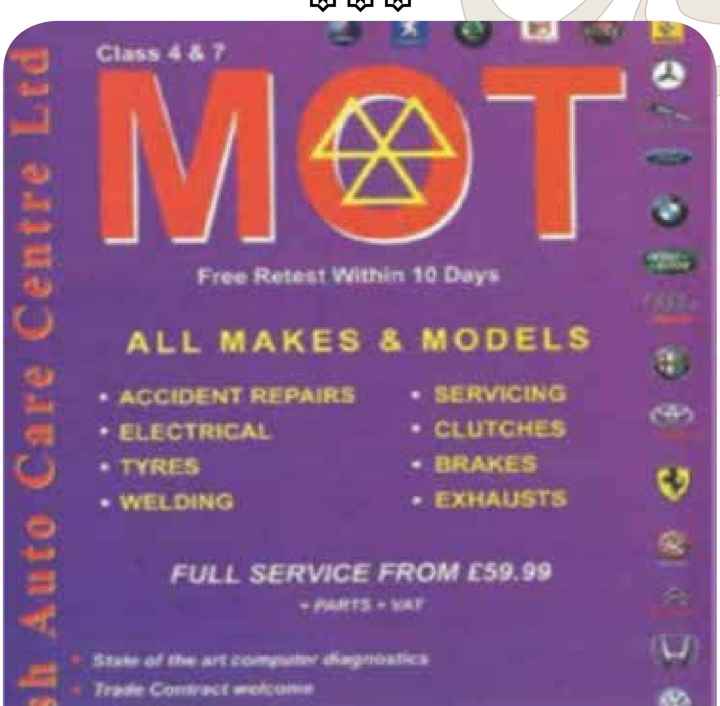

اکتوبر میں پیش آنے والے ملکی تاریخ کے اہم واقعات

اکتوبر میں پاکستان کی تاریخ میں بہت بڑے بڑے واقعات پیش آئے جن میں ایک وزیر اعظم کا قتل دوسرے کا استعفیٰ اور تیسرے کی برطرفی بھی شامل ہے، اس کے علاوہ اسی مہینے میں دھماکے بھی ہوئے اور زلزلے بھی آئے جبکہ کئی نامور لوگوں کا قتل بھی ہوا ہے۔

آیئے ذرا تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں کہ ماہِ اکتوبر میں کب اور کیا واقعہ پیش آیا۔

۷ اکتوبر ۱۹۴۷ کو ریاست بہاولپور نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا اعلان کیا، جس کے بعد دیگر ریاستیں بھی ایک ایک کر کے پاکستان کا حصہ بن گئیں، جبکہ ۱۱ اکتوبر کو ریاست خیر پور نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا اعلان کیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ کو روزنامہ جنگ کراچی نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ کو ہزاروں قبائلیوں نے اپنی مسلح جدوجہد سے ڈوگرہ راجہ مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف جہاد کے ذریعے مظفر آباد تک رسائی حاصل کر لی اور وہاں آزاد کشمیر کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا، اسی وقت ان کے قاتل سید اکبر علی کو بھی گولی مار دی گئی۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ کو حکومت کی طرف سے کراچی میں جمعہ کے دن گوشت کا ناغے کا اعلان بھی کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ کو کراچی سے ڈھاکا جانے والے اورینٹ ایئر بس کا طیارہ بھارت میں جمشید پور کے قریب گر کر تباہ ہو گیا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۲ کو پاکستان کرکٹ ٹیم لاہور سے امرتسر بھارت کے دورے پر روانہ ہوئی اور ۱۶ سے ۱۹ اکتوبر تک پاکستان نے بھارت کے ساتھ دہلی کے فیروز شاہ اسٹیڈیم میں اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ کو قائداعظم محمد علی جناح کے اسکول کا وہ رجسٹر جس میں قائداعظم کے کوائف اور ان کے دستخط موجود ہیں اسے حکومت پاکستان نے اپنی تحویل میں لے کر قومی عجائب گھر میں رکھ دیا۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۳ کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے ڈرگ روڈ کراچی میں مہاجرین کی بستی کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۴ کو حکومت نے لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کے لیے انگریز ماہر سی ڈبلیو یورین کی خدمات حاصل کیں۔ ۶ اکتوبر ۱۹۵۵ کو میجر جنرل اسکندر مرزا نے پاکستان کے مستقل گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ کو مشرقی بنگال کا نام مشرقی پاکستان رکھنے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ کو نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا، اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۵ کو پاکستان کے امتیاز احمد نے نیوزی لینڈ کے خلاف اپنی پہلی ڈبل سنچری اسکور کی اور دوسری اننگ میں وہ صفر پر آؤٹ ہو گئے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ کو کمشنر کراچی نے لالو کھیت اور کورنگی میں دو نئی مہاجر بستیاں تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۶ کو ایک دن میں سب سے کم اسکور کا عالمی ریکارڈ پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان میچ میں بنا، جس میں آسٹریلین ٹیم پاکستان کے خلاف ۸۰ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۷ کو پاکستان کے صدر اسکندر مرزا نے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی سے استعفیٰ لے لیا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ کو اسماعیل ابراہیم چندریگر نے پاکستان کے چھٹے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۹ کو شاہی قلعہ لاہور میں کھدائی کے دوران محمود غزنوی کے سکے برآمد ہوئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۰ کو پاکستان کے وزیر خزانہ محمد شعیب عالمی بینک کے ڈائریکٹر منتخب ہوئے۔ ۵ اکتوبر ۱۹۶۰ کو کراچی کے علاقے لالو کھیت کا نام لیاقت آباد رکھنے کی قرارداد منظور کر لی گئی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۰ کو گجرات میں قائد ملت لیاقت علی خان کے قاتل سید اکبر علی کو گولی مارنے والے سب انسپکٹر محمد شاہ کو کلہاڑیاں مار مار کر قتل کر دیا گیا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۰ کو صدر ایوب خان نے کراچی میں ولیکا سیمنٹ فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ کو کراچی کی گلیوں میں ٹیلی ویژن کی نمائش کی گئی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ کو لاہور میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کو قتل کرنے کی کوشش ناکام بنا دی گئی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ کو پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور دوسرے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کا انتقال ہوا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ کو کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچ میں پاکستان کے تین سگے بھائیوں نے شرکت کی جن میں حنیف محمد، مشتاق محمد اور صادق محمد شامل تھے، اس ٹیسٹ میچ میں اوپننگ حنیف محمد اور صادق محمد نے کی جبکہ مشتاق محمد چوتھے نمبر پر بیٹنگ کرنے کے لیے آئے یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا اور اب تک کا واحد ٹیسٹ تھا جس میں تین سگے بھائیوں نے ایک ساتھ شرکت کی تھی۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ کو پاکستان دو سال کے لیے سلامتی کونسل کا غیر مستقل رکن منتخب ہوا اور یکم جنوری ۱۹۷۶ کو پاکستان نے سلامتی کونسل میں اپنی نشست سنبھال لی، اس سے پہلے پاکستان دو مرتبہ ۵۳-۱۹۵۲ اور ۶۹-۱۹۶۸ میں سلامتی کونسل کا رکن منتخب ہو چکا تھا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ کو اسلام آباد میں فیصل مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جس کی تعمیر ۲ جون ۱۹۸۶ کو مکمل ہوئی جبکہ سنگ بنیاد سعودی عرب کے شاہ خالد نے رکھا تھا۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۶ کو پاکستانی کرکٹ ٹیم کے مایہ ناز بلے باز جاوید میانداد نے لاہور میں نیوزی لینڈ کے خلاف اپنے ٹیسٹ کریئر کا آغاز کیا۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۹ کو کراچی میں بکرے کے گوشت کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۱۸ روپے فی کلو جبکہ گائے کے گوشت کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۱۰ روپے فی کلو مقرر کی گئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۳۵ ویں سالانہ اجلاس سے خطاب کیا، جہاں ان کی تقریر کا موضوع ''بنی نوع انسان کے لیے اسلام کا پیغام'' تھا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ اور ۸ ملکوں کے تاریخی سفر سے واپسی پر عوام کی طرف سے صدر جنرل ضیاء الحق کا تاریخی استقبال کیا گیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ کو جمعیت علمائے اسلام کے سیکریٹری جنرل مولانا مفتی محمود کراچی میں انتقال فرما گئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو پیپلز پارٹی کے نثار کھوڑو کے تایا اور سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کی وفات کراچی میں

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل

ہوئی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۰ کو حکومت کی طرف سے پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کے بعد پیٹرول کی قیمت ۵ روپے فی لیٹر ہوگئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۱ کو روزنامہ جنگ لاہور نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳ کو عمران خان کو آسٹریلیا کے دورے کے لیے کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کر دیا گیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل پر پاکستان میں تین دن تک یوم سوگ منائے جانے کا اعلان کیا گیا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۵ کو ظہیر عباس نے پاکستان ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ کو قاضی حسین احمد جماعت اسلامی کے امیر منتخب ہوئے جو مسلسل چار بار منتخب ہونے کے بعد ۲۰۰۸ تک امیر جماعت رہے۔ اکتوبر ۱۹۸۸ اور ۱۹۸۹ میں کراچی سمیت سندھ بھر میں خونریزی کے واقعات سمیت شدید ہنگامہ آرائی ہوئی جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ سینکڑوں گاڑیاں و دیگر املاک بھی نذر آتش کر دی گئیں۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ کی شام حیدر آباد میں نامعلوم مسلح افراد کی طرف سے شہر کے کئی گنجان آباد علاقوں میں اندھادھند فائرنگ کی گئی جس کے نتیجے میں ۲۰ منٹ کے اندر ۱۸۰ افراد جاں بحق اور سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے۔ اگلے دن یکم اکتوبر کو اس کے ردعمل میں کراچی میں فسادات پھوٹ پڑے جس میں ۷۸ بے گناہ افراد اپنی جان سے دھو بیٹھے۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۹ کو سکھر ایئر پورٹ پر قومی پرچم کی بے حرمتی کی گئی، پھر ۴ اکتوبر کو جی ایم سید اور ان کے ساتھیوں پر قومی پرچم کی بے حرمتی کرنے کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کیا گیا ۔ ۱۲ اکتوبر کو کراچی میں جی ایم سید کی گرفتاری کے خلاف ایم اے جناح روڈ پر احتجاج و ہنگامہ آرائی کے باعث کئی گاڑیاں نذ آتش کر دی گئیں۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ایم کیو ایم کے صوبائی وزراء جاوید اختر، شمس العارفین اور الطاف حسین کاظمی پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۹ کو وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو نے اسلام آباد میں سپریم کورٹ کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۰ کو سندھ کے نگراں وزیر اعلیٰ جام صادق علی نے الطاف حسین کے خلاف تمام مقدمات واپس لینے کا اعلان کیا۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۱ کو کراچی میں ہفت روزہ میگزین ’تکبیر‘ کے ایڈیٹر صلاح الدین کے گھر پر حملہ کیا گیا، جوابی فائرنگ میں ۱۷ سالہ نوجوان شعیب جاں بحق ہوگیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۳ کو الطاف حسین نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا، جبکہ ۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ایم کیو ایم نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو بینظیر بھٹو وزیر اعظم منتخب ہوگئیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۹۸ کو آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور وزیر اعظم نواز شریف نے منگلا کے کور کمانڈر لیفٹننٹ جنرل پرویز مشرف کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر دیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کو جنرل پرویز مشرف نے وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر دیا اور جنرل مشرف ملک کے چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۹ کو چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے چاروں صوبوں میں گورنروں کی تقرری کا اعلان کیا، جن میں لیفٹننٹ جنرل (ر) محمد شفیق صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا)، لیفٹننٹ جنرل محمد صفدر کو پنجاب کا جبکہ ایئر مارشل (ر) عظیم داؤد پوتہ کو سندھ اور جسٹس (ر) امیر الملک مینگل کو بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۲۸ اکتوبر ۲۰۰۰ کو لاہور میں پاکستان کی پہلی فوڈ اسٹریٹ کا افتتاح کیا گیا، یہ فوڈ اسٹریٹ گوالمنڈی میں چیمبرلین روڈ پر قائم کی گئی۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۲ کو جیو نیوز نے اپنی باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا۔ ۵ اکتوبر ۲۰۰۲ : ۵ اور ۶ اکتوبر کی درمیانی شب گھڑیاں واپس ایک گھنٹہ پیچھے کر دی گئیں۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۲ روزنامہ جنگ نے ملتان سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۲ کو کراچی میں محکمہ داخلہ، ڈی آئی جی اور سی آئی ڈی دفاتر میں پارسل بموں کے ذریعے دھماکے ہوئے جس میں ۹ افراد زخمی ہوئے۔ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۲ کو آزاد کشمیر میں اردو کی جگہ انگریزی کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔ ۶ اکتوبر ۲۰۰۳ کو رکن قومی اسمبلی اور تنظیم ملت اسلامیہ کے سربراہ مولانا اعظم طارق اپنے چار ساتھیوں سمیت دہشتگردوں کی فائرنگ سے جاں بحق ہو گئے۔ ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ کو مسلم لیگ ن کے قائد و سابق وزیر اعظم نواز شریف کے والد میاں محمد شریف جدہ میں وفات پا گئے۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۴ کو ٹی وی کی معروف فنکارہ و پروڈیوسر آفرین بیگ کو کراچی میں قتل کر دیا گیا، آفرین بیگ ۱۴ اکتوبر کو کلفٹن میں واقع اپنے گھر میں پراسرار طور پر مردہ پائی گئی تھیں، پولیس نے ان کے قتل کے الزام میں آفرین بیگ کے شوہر فاروق مینگل کو گرفتار کر لیا تھا۔ ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۴ کراچی کے سٹی ناظم نعمت اللہ خان نے کراچی میں ایف ٹی سی فلائی اوور کا افتتاح کیا تھا۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۴ کو سیالکوٹ کی مسجد میں بم دھماکا ہوا، جس میں ۳۰ نمازی شہید اور ۵۰ زخمی ہو گئے۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۵ کو ایم کیو ایم کے سید مصطفی کمال سٹی ناظم مقرر ہوئے۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ کو اسلام آباد، سرحد، پنجاب اور آزاد کشمیر میں ملکی تاریخ کا بدترین زلزلہ آیا جس کے نتیجے میں ۵۰ ہزار سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے اور کئی علاقے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ ۵ اکتوبر ۲۰۰۶ کو اسلام آباد میں پارلیمنٹ لاجز کے قریب سے دو راکٹ برآمد ہوئے، جس کے بعد انٹیلی جنس اداروں نے سات افراد کو گرفتار کر لیا۔ ۶ اکتوبر ۲۰۰۶ شہر یار خان نے پاکستان کرکٹ بورڈ کی سربراہی سے استعفیٰ دے دیا، ان کے بعد ڈاکٹر نسیم اشرف پی سی بی کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ ۲۷ اکتوبر ۲۰۰۶ کو پاکستان کے سابق صدر غلام اسحاق خان پشاور میں وفات پا گئے۔ ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۶ کو باجوڑ میں مدرسے پر امریکی بمباری سے غیر ملکیوں سمیت ۸۳ افراد جاں بحق ہوئے جن میں مدرسے میں پڑھنے والے بچے بھی شامل تھے۔ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ کو انضمام الحق نے اپنا آخری ٹیسٹ میچ جنوبی افریقہ کے خلاف کھیلا۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ کو بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی ہوئی اور ان کے استقبال کے لیے منعقدہ جلوس میں ۲ بم دھماکے ہوئے جس میں ۱۳۸ افراد جاں بحق ہوئے۔ ۵ اکتوبر ۲۰۰۸ کو مردان میں وزیر اعلیٰ کے پی کے امیر حیدر خان ہوتی کے آبائی گھر پر راکٹ حملہ ہوا، حملے کے وقت امیر حیدر خان ہوتی کے والد اعظم ہوتی گھر پر موجود تھے۔ ۶ اکتوبر ۲۰۰۸ کو بھکر میں رکن قومی اسمبلی رشید اکبر نوانی کے ڈیرے پر خودکش حملہ ہوا، جس میں ۲۶ افراد جاں بحق ہوئے۔ ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۸ کو بلوچستان میں شدید زلزلہ آیا جس میں ۲۱۰ افراد جاں بحق ہوئے۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۸ کو شمالی اور جنوبی وزیرستان میں امریکی میزائل حملے میں ۳۳ افراد جاں بحق ہوئے۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۸ کو ملک بھر میں رات بارہ بجے گھڑیاں ایک گھنٹا پیچھے کر دی گئیں۔

شعبہ پاکستان

بن برکھا برسات اور پت جھڑ کی تاویل آرائی

تحریر: وجاہت مسعود

برادر مکرم نے دیار افرنگ سے فون کر کے احوال دریافت کیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ آمدہ خزاں کے منتظر نیم زرد پتے کی نوک پر ایک قطرہ آب لرز رہا ہے' کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی' سجاد باقر کا ٹکڑا دہرا دیا، 'پوچھتے کیا ہو باقر کے شام و سحر'۔ ہمارے تپتے ہوئے موسمی نقشے پر سال میں دو مختصر وقفے ہی خوشگوار ہوتے ہیں۔ فروری کا نصف اول اور پھر اواخر جولائی کی شامیں اور اوائل اگست کی راتیں۔ اس دفعہ برسات پر بھی ایسا بجوگ پڑا کہ 'نیناں نیند نہ سہائے، گھنشام نہیں آئے'۔ مقامی موسمیاتی مرکز نے اعداد و شمار سے بتایا ہے کہ اس برس کشمیر اور پنجاب میں معمول سے بہت کم بارش ہوئی۔ اگست کے پورے مہینے میں میانوالی، سرگودھا، شورکوٹ، بہاولنگر، ڈیرہ غازی خان، ملتان، رحیم یار خان، خانپور، لیہ اور خانیوال جیسے مقامات پر چھینٹا ہی نہیں پڑا۔ دلوں کے بھیتر البتہ نمک گھلتا رہا۔ راج نیتی کے دیوتا مگر یہ کب دیکھتے ہیں کہ ان کے دماغ عالی اور نگہ بے بصر کی ایک تجلی سے کتنے گھر جل جاتے ہیں، بچوں کی آنکھ میں خوف ڈیرے ڈال لیتا ہے، جوانوں کے خواب جھوٹے پڑ جاتے ہیں اور جمی جمائی بستیوں میں آباد نسلیں کئی قرن پیچھے چلی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں مغرب کے کسی رجائیت پسند ذہن کی لکھی ایک کتاب دیکھنے کا موقع ملا۔ مصنف نے بہت عرق ریزی سے بتایا کہ گزشتہ سو برس میں جنگوں میں مرنے والوں کی شرح فیصد بہت کم ہوئی ہے اور آج کا انسان ماضی کے مقابلے میں جنگ اور قحط جیسے خطرات سے کہیں زیادہ محفوظ ہو چکا ہے۔ امید کی جوت انسانی اثاثوں میں سے ایک ہے۔ تاہم حالیہ تاریخ کو دیکھتے ہوئے رجائیت کے غیر مشروط بیان سے کچھ دفتری کارروائی جیسا احساس ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس پیمانے پر جنگی تصادم نہیں ہوا لیکن مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ سے لے کر لاطینی امریکا، افریقہ اور جنوبی ایشیا تک درجنوں جنگوں میں کروڑوں انسانوں کی بے مقصد موت کا مشاہدہ کرنے والوں کو شرح فیصد کے ہندسوں سے کیا تسکین مل سکتی ہے۔ ریاستوں کا داخلی استبداد اپنی جگہ ایک بلائے بے درماں ہے۔ قومی آزادیوں کا حصول ایک بڑی جست تھی لیکن یہ نصب العین پیوستہ مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہم نے بتدریج طاقت کو آدرش اور سرمائے کو انصاف پر غالب آتے دیکھا۔ گزشتہ نصف صدی میں انسانیت کی بالائی پرت نے علم اور معیشت میں ترقی کے نئے معیار قائم کیے لیکن پچھڑے ہوئے خطوں میں جہالت، غربت، محرومی، ناانصافی اور استحصال کے ہوتے ہوئے منتخب منطقوں میں ترقی کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ خود ترقی یافتہ ریاستوں کی غلام گردشوں میں بہت سے استخوانی ڈھانچے ابھی گردش میں ہیں۔ یہ محض اسلحے، منشیات اور دوسرے علانیہ جرائم کا معاملہ نہیں بلکہ ریاستوں میں ادارہ جاتی سطح پر اخفا کے پردے میں بہت کچھ ایسا ہے جس کا دفاع نہیں کیا جا سکتا سرمائے، آزادی، اختیار اور انصاف میں توازن، یہی آج کا سیاسی سوال ہے۔ جرمن ادیب تھامس مان نے گزشتہ صدی میں ایک پتے کی بات کہی، 'In our time, the destiny of man presents its meanings in political terms'۔ (ہمارے عہد میں انسانی تقدیر سیاسی اصطلاحات میں اپنا معنی ظاہر کرتی ہے۔) سوال یہ ہے کہ کیا سیاست کسی ریاستی منصب کی خواہش ہے؟ کیا سیاست کسی سیاسی رہنما یا جماعت کی حمایت یا مخالفت کا قصہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سیاست عورت اور مرد کی خلوت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ کمرہ جماعت میں استاد اور طالب علم کا رشتہ بھی سیاست سے متعین ہوتا ہے۔ سیاست وہ نقطہ ہے جہاں کھڑے ہو کر ہم اس زمین کو دیکھتے ہیں اور اپنی زندگی کا زاویہ طے کرتے ہیں۔ سیاست اپنے خالص ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد سے ہم آہنگ کرنے کی سعی ہے۔ اسی نقطے کی سولی پر پیمبر بات کرتے ہیں۔ اسی سے ہماری سیاسی اور معاشرتی اقدار طے پاتی ہیں۔ اقدار کا سوال آیا تو کراچی میں پی ڈی ایم کا جلسہ دیکھ لیجیے۔ جلسے سے ایک روز قبل جے یو آئی (ف) سندھ کے جنرل سیکرٹری مولانا راشد سومرو نے خواتین کو جلسے میں شریک ہونے سے منع کر دیا۔ فرمایا کہ 'ہم خواتین کی مخالفت نہیں کر رہے بلکہ ان کے احترام میں انہیں جلسے میں شریک ہونے سے روک رہے ہیں۔' تاہم دوسرے روز مولانا فضل الرحمن نے خواتین کے احترام کی ایک مختلف تشریح کرتے ہوئے انہیں شرکت کی اجازت دے دی۔ کل ملا کے نتیجہ یہ نکلا کہ دو کروڑ کی آبادی کے شہر کراچی سے درجن بھر خواتین جلسے میں شریک ہوئیں۔ جمہوریت کی بنیاد عقیدے، صنف اور زبان کے کسی فرق سے قطع نظر مکمل انسانی مساوات ہے۔ جمہوریت کا مقصد پنیالہ خوردنز ڈیرہ اسماعیل خان سے اسمبلی کی نشست جیتنا نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے تمام معاملات بالخصوص وسائل کی تقسیم پر فیصلہ سازی میں تمام شہریوں کی شرکت کا مساوی حق ہے۔ اگر خود کو جمہوری تحریک کہلانے والا سیاسی اتحاد ملک کی آدھی آبادی کو اس مساوات کا اہل نہیں سمجھتا تو اسے جمہوری تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ عورت اور مرد میں جسمانی فرق موجود ہے لیکن ہمارے دستور کی شق ۲۵ دونوں اصناف کے رتبے، حقوق، صلاحیت اور اہلیت میں امتیاز کو تسلیم نہیں کرتی۔ اگر کسی خاص معاشرتی سانچے یا سیاسی نظام کے پیروکار عورت اور مرد کے لئے الگ الگ معاشرتی، معاشی اور سیاسی کردار میں یقین رکھتے ہیں تو انہیں اپنی رائے کا حق ہے لیکن ایسی رائے جمہوریت تو ایک طرف، انسانیت کی توہین کے مترادف ہے۔ ستمبر ۲۰۲۰ میں پی ڈی ایم نے اپنے اساسی اعلامیہ میں شفاف جمہوریت کے نصب العین کا اعلان کیا تھا۔ یہ کیسی جمہوریت ہے جو عورت اور مرد میں تفریق روا رکھتی ہے۔ لیجیے احمد مشتاق یاد آ گئے

یہ جو بھی ہو، بہار نہیں ہے جناب من
کس وہم میں ہیں دیکھنے والے پڑے ہوئے

بھیرہ

تحریر: سحر بلوچ

اسلام آباد اور لاہور کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر' جہاں تاریخ کے کئی راز دفن ہیں

بھیرہ کا نام آپ نے اسلام آباد سے لاہور آتے یا جاتے ہوئے ایک فوڈ جنکشن کے طور پر ضرور سُنا ہو گا۔ مگر اس کی منفرد تاریخ کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

پاکستان کے دو اہم شہروں کو ملانے والی موٹر وے ایم ٹو کے بیچ میں واقع بھیرہ قیام وطعام اس سڑک پر سب سے بڑا ریسٹ ایریا اور فوڈ جنکشن ہے۔ تاہم اس شہر کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات رکھنا اس کی تاریخ سے ناانصافی ہے۔

میں نے بھیرہ کے بارے میں دو سال پہلے سُنا تھا کہ یہاں پر برصغیر کی تقسیم سے پہلے کا ایک قدیم ریلوے سٹیشن موجود ہے جو کافی عرصے سے بند پڑا ہوا ہے۔ پہلی بار یہاں آنے پر مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ یہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ شہر کے بیچ و بیچ ہونے کے باوجود یہ سٹیشن نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے۔ رواں سال وفات پانے والی پاکستانی اداکارہ نیلو کا تعلق بھی بھیرہ سے تھا۔ بھیرہ آنے پر پتا چلا کہ ایک پرانا اور ایک نیا بھیرہ ہے۔ گردوارہ، مندر، مسجد اور امام بارگاہ کے علاوہ دیگر مذہبی مقامات بھی ہیں۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ اتنے چھوٹے سے شہر میں اتنی تاریخ کیسے سمائی ہوئی ہے۔

بھیرہ کا قدیم ریلوے سٹیشن جو 'میوزیم بن سکتا ہے'

تو پہلے بات کرتے ہیں اس ریلوے سٹیشن کی۔ یہاں ریلوے سٹیشن پہنچ کر سب سے پہلے میری نظر پڑی بھیرہ نام کی تختی پر جو اس سٹیشن کے داخلی راستے کے اوپر لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں باقاعدہ طور پر کوئی بورڈ نہیں جو بتائے کہ یہ ریلوے سٹیشن کب اور کیوں بنایا گیا تھا۔ پھر ملاقات ہوئی یہاں پر براجمان بھینسوں سے۔ کئی سالوں سے خالی رہنے کی وجہ سے اس جگہ پر اب جانور ہی نظر آتے ہیں۔ جو کمرہ کسی زمانے میں فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے مختص کیا گیا تھا، وہاں اب صرف گوبر، گندگی اور مکڑیوں کے جالے نظر آتے ہیں۔

تھوڑا آگے جا کر اس سٹیشن کا ٹرن ٹیبل بھی آتا ہے جہاں اب زنگ آلود گاڑیوں کے ڈھانچوں کے علاوہ کچھ نہیں۔

ظاہر ہے یہ جگہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ تو پھر اس سٹیشن کی تاریخ کیا ہے، اور یہ کس سال میں کس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا؟ اس دوران مجھے بھیرہ کی تاریخ کو یکجا کرنے والے محقق کرنل ریٹائرڈ زاہد ممتاز کے بارے میں پتا چلا۔ زاہد ممتاز خود کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہیں۔ ان کی اپنی پیدائش بھیرہ کی ہے اور حالانکہ انھوں نے یہاں بچپن تو نہیں گزارا لیکن بڑے ہونے کے بعد ان کا ایک ہی مقصد بن گیا، اس علاقے کی شناخت کو دوبارہ بحال کرنا۔ بھیرہ کے اس ریلوے سٹیشن کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ یہ سنہ ۱۸۸۱ میں بنایا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر یہاں سے چلنے والی ٹرین بھیرہ، ہزارہ، میانی اور ملک وال کے علاقوں کے درمیان تیس کلومیٹر تک چلا کرتی تھی۔ لیکن بعد میں اس کو بند کر دیا گیا۔

زاہد ممتاز نے کہا کہ '(عارضی طور پر) کچھ سال چلنے کے بعد اس ریلوے سٹیشن کو سنہ ۲۰۰۵ سے سنہ ۲۰۰۶ کے درمیان بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی پر یہ فرق پڑا کہ وہ جس آسانی سے مال مویشی اس ٹرین کے ذریعے لے جا سکتے تھے وہ اب ممکن نہیں تھا۔ اس ٹرین کی جگہ گاڑیوں نے لے لی جن کے کرائے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔'

مگر 'اب بھی بات نہیں بگڑی ہے۔' زاہد کی تجویز ہے کہ 'آج بھی اس جگہ کی متنوع تاریخ کو یکجا کیا جا سکتا ہے، اگر اس سٹیشن کو میوزیم کی شکل دے دی جائے جس طرح اسلام آباد کے گولڑہ سٹیشن کے ساتھ کیا گیا ہے۔' اس ٹرین پر آپ دس روپے ٹکٹ میں با آسانی عام سامان کے ساتھ بھیڑ بکریاں لا سکتے تھے۔ لیکن اس کے بند ہونے سے یہاں کے لوگوں کو پھر دوسرا طریقہ کار اپنانا پڑا۔

بھیرہ کی تاریخی مسجد اور مندر

اس ریلوے سٹیشن پر ذرا ٹھہر کر دوبارہ بات کرتے ہیں۔ پہلے ذرا بھیرہ کی تاریخ سمجھ لیں۔ بھیرہ کی اپنی تاریخ بھی خاصی منفرد ہے۔ اس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ علاقہ ۵۰۰ قبلِ مسیح سے یہاں موجود ہے۔ اس کی ایک تصدیق تو یہاں پرانے علاقوں کے قدیم طرز سے بنے ٹیلوں سے ہو سکتی ہے۔ ان کے نیچے کیا چھپا ہے، اس پر کبھی تحقیق نہیں کی گئی۔ اور نئے بھیرہ کی تاریخ یہ ہے کہ یہاں خلجی، شیر شاہ سُوری اور مغل دور میں بنے مندر، مسجد اور گردوارہ اس کے ماضی اور ان تمام لوگوں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں، جو اب یہاں نہیں رہتے۔ لیکن نیا بھیرہ ہو یا پرانا، تاریخ دان اور محقق کہتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک وقت تک مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔

دریائے جہلم کے مغربی اطراف بننے کے بعد بھیرہ کو سولہویں صدی میں دریائے جہلم کے مشرقی جانب قائم کیا گیا تاکہ اسے گزرنے والی افواج کے حملوں سے بچایا جا سکے۔

اس علاقے کے اطراف میں آٹھ دروازے ہیں لیکن ان میں سے اب زیادہ تر یا تو وقت گزرنے کے ساتھ گِر گئے ہیں یا پھر گرنے والے ہیں۔ برِصغیر کی تقسیم سے پہلے موجود مختلف محلوں میں سے چند مشہور محلوں میں شیخاں والہ، ننگیان والہ، باؤلی والہ اور خواجگان محلہ شامل ہیں۔ ان تمام محلوں میں مختلف مذاہب کی تعمیرات ہیں، جن میں مساجد، مندر، گردوارے اور حویلیاں موجود ہیں۔ کچھ بالکل خستہ حالت میں ہیں جبکہ کچھ کو تھوڑی مرمت کر کے اب بھی بچایا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے میں نے رُخ کیا جامعہ مسجد کا۔

شیر شاہ سُوری کے دور کی کہلائی جانے والی اس مسجد کی عمارت کے باہر تختی پر اس کی تعمیر سنہ ۱۵۴۰ لکھا ہوا ہے۔لیکن اس مسجد کا طرزِ تعمیر مغل دور کا لگتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اسے مغل دور میں دوبارہ سے بنوایا گیا تھا۔یہاں ہونے والے رنگ و روغن سے لگتا ہے کہ اسے کئی بار پہلے بھی رنگ کیا جا چکا ہے۔

لیکن اس کے نیچے اب بھی قدیم طرز کا کام دکھائی دیتا ہے۔

اسی مسجد سے تھوڑے فاصلے پر شہر کا مشہور بازار آتا ہے جہاں کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک امام بارگاہ نظر آتی ہے۔

اس امام بارگاہ کے بارے میں مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس سے پہلے گردوارہ ہوا کرتا تھا جسے شہر کے بیچ و بیچ تعمیر کرایا گیا تھا۔

لیکن برِصغیر کی تقسیم کے بعد جب یہاں سے سکھوں کا جانا ہوا، تو اس گردوارے نے امام بارگاہ کی شکل دے دی گئی۔

دریائے جہلم کے راستے میں باؤلی والا مندر آتا ہے جو شہر سے الگ تھلگ ایک پُرسکون مقام پر ہے۔

اس مندر کے آس پاس جھاڑیوں سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کافی عرصے سے خالی ہے۔

اس مندر کے بارے میں زاہد ممتاز نے کہا کہ اسے اندر سے ٹھیک کروا کر اسے پاکستان میں رہائش پذیر ہندوؤں کے لیے کھولا جا سکتا ہے۔

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر رہنے والے ہندو تجارت کیا کرتے تھے اور سنہ ۱۹۴۱ تک ہندو یہاں کی بیس ہزار افراد پر مشتمل آبادی کا اکیس فیصد حصہ تھے۔

گھوم پھر کر جب دوبارہ بھیرہ کے ریلوے سٹیشن کی طرف پہنچے تو خیال آیا کہ یہ تمام تر تاریخ اس سے کہیں زیادہ یکجا کی جا سکتی ہے۔

سنہ ۱۹۹۵ میں جب موٹروے بنا تو آس پاس کے علاقوں کو موقع ملا کہ وہ اپنے تاریخی مقامات کے بارے میں بات کرنے لگ گئے، ان کے معاشی حالات بہتر ہو گئے۔لیکن بھیرہ کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کی گئی۔

بھیرہ اگر آج بھی مشہور ہے تو صرف اس وجہ سے کہ یہاں موٹروے قیام و طعام پر ایک فوڈ جنکشن موجود ہے، جہاں لوگ آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں۔

لیکن بھیرہ کی تاریخ کو اگر مکمل طور پر محفوظ کیا جا سکتا ہے تو وہ اسی ریلوے سٹیشن کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔

جامعہ مسجد کی دیوار پر اہلیانِ بھیرہ کے نام ایک واضح پیغام ہے۔'اس شہر کی عزت اس کی تاریخ سے ہے جس کی عظیم اور قدیم داستانیں اس مسجد کی ایک ایک اینٹ میں دفن ہیں۔اگر آپ نے ان یادگاروں کو پس پشت ڈال دیا تو تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔'

❁❁❁

Lahore International Magazine
@lahoreintl
@lahoreintl
lahoreinternational
lahoreinternational
lahoreintl
+447940077825
+447940077825
lahoreintlondon@gmail.com

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،......ہو۔ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ.....اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

12 اکتوبر: جنرل مشرف کا کراچی ایئرپورٹ پر لینڈنگ سے عزیز ہم وطنو تک کا سفر

تحریر: فاروق عادل

کسی سنسنی خیز فلم کی طرح دیکھنے والے کے اعصاب کو مسلسل تناؤ میں رکھنے والے اُن واقعات کا آغاز شام پانچ بجے ٹیلی ویژن کے ایک خصوصی نیوز بلیٹن سے ہوا۔ رات ایک بج کر چالیس منٹ پر یہ فلم اپنے نقطہ عروج پر اس وقت پہنچی جب جنرل پرویز مشرف کیمرے کے سامنے آئے۔ اُس وقت وہ شدید اعصابی تناؤ کا شکار دکھائی دیے، چنانچہ کیمرے بند کر کے انھیں جُوس پیش کیا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ کچھ دیر وہ آرام کر لیں۔

یہ واقعات ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کے ہیں جب پاکستان اچانک ایک ایسے دوراہے پر جا کھڑا ہوا جب تاریخ میں پہلی بار اختیار نہ کسی آرمی چیف کے ہاتھ میں تھا اور نہ راولپنڈی کور اور اُس کے ٹرپل ون بریگیڈ کے جو ہمیشہ ایسے مواقع بروئے کار لا کر ایک نئے دور کی بنیاد رکھتے ہیں۔

اِس بار ترپ کا یہ پتہ کراچی کور اور اس کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی کے ہاتھ میں تھا، جو چاہتے تو پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی کر سکتے تھے۔

پاکستان ٹیلی ویژن نے جب یہ اطلاع نشر کی کہ وزیر اعظم نواز شریف نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کو ریٹائر کر کے جنرل ضیاالدین کو یہ منصب سونپ دیا ہے تو پاکستان کے عوام اور خاص طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بہت سی فوجی چھاؤنیوں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی اور سینیئر فوجی افسران ایک دوسرے سے رابطے میں مصروف ہو گئے کہ اب کیا کرنا ہے؟

اس موقع پر کی جانے والی ٹیلی فون کی چند کالز ایسی ہیں جنھوں نے حالات کو واضح رُخ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کراچی کے ڈائریکٹر کرنل اشفاق حسین نے اپنی کتاب 'جنٹلمین استغفر اللہ' میں ان رابطوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

جنرل عثمانی کو موصول ہونے والی فون کالز

واقعات کی ترتیب کے اعتبار سے پہلا فون فائیو (کراچی) کور کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر طارق سہیل نے کور کمانڈر جنرل عثمانی کو کیا جنھوں نے اپنے باس کو فوج کی کمان میں کی جانے والی تبدیلی سے آگاہ کیا۔ بریگیڈیئر طارق کو یہ اطلاع ٹیلی ویژن سے ملی تھی۔

جنرل عثمانی کو دوسرا فون وزیر اعظم ہاؤس سے کسی نے کیا جس میں انھیں بتایا گیا کہ وزیر اعظم کو آپ کے علیل بیٹے کی صحت کے بارے میں بہت تشویش ہے اور اگر آپ چاہیں تو علاج کے لیے اسے بیرون ملک بھجوایا جا سکتا ہے۔

جنرل عثمانی کو تیسرا فون چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل محمود نے کیا اور اُن سے مشورہ چاہا کہ اب کیا کیا جائے؟ مسلح افواج کے ان دونوں ذمہ داران کے درمیان ہونے والی بات چیت مختصر لیکن واضح تھی جس کے بعد جسے بھی جو کرنا تھا، اس کے ذہن میں کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اس فون کال کے دوران جنرل عثمانی نے جنرل محمود سے سوال کیا: کیا ایسی صورتحال کے بارے میں جنرل مشرف نے کچھ ہدایات دی تھیں؟

جنرل محمود: جی۔

جنرل عثمانی: بس تو پھر ان ہدایات پر عمل کیا جائے۔

جنرل عثمانی اور جنرل محمود کے درمیان ہونے والے اس مکالمے سے اس تاثر کی نفی ہوتی ہے کہ فوج اقتدار سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس سلسلے میں جنرل مشرف کے کئی بیانات بھی ریکارڈ پر موجود ہیں۔

اپنی کتاب 'سب سے پہلے پاکستان' میں بھی انھوں نے کچھ اسی قسم کی بات کی ہے لیکن اسی کتاب میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جنرل عزیز جانتے تھے کہ اُنھیں کیا کرنا ہے۔ جنرل شاہد عزیز کو کیا کرنا تھا، اس کی تفصیلات انھوں نے اپنی کتاب 'یہ خاموشی کہاں تک' میں بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ نہایت احتیاط سے پورا منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا جس کی تفصیلات قابل اعتماد جرنیلوں کے لیپ ٹاپ میں بھی موجود تھیں۔

جنرل عثمانی کو چوتھا فون تھوڑی ہی دیر پہلے وزیر اعظم کی طرف سے نامزد کیے جانے والے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاالدین نے کیا جنھوں نے اپنے تقرر نیز نئی تبدیلیوں سے آگاہ کرنے کے بعد انھیں ہدایت دی کہ وہ ایئرپورٹ پر جا کر جنرل مشرف کا استقبال کریں اور انھیں پورے احترام سے آرمی ہاؤس پہنچا دیں۔

یہ فون بند ہوا ہی ہو گا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی، اس بار دوسری طرف وزیر اعظم نواز شریف کے ملٹری سیکریٹری بریگیڈیئر جاوید اقبال تھے۔ اُن کا پیغام مختصر اور واضح تھا کہ جنرل پرویز مشرف کو پروٹوکول دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ کہ انھیں آرمی ہاؤس میں محبوس کر دیا جائے۔

اوپر تلے ہونے والے ان رابطوں سے یہ تو واضح ہو گیا کہ آنے والے چند گھنٹوں میں جو کچھ بھی ہونا ہے، جنرل عثمانی کا کردار اس میں کلیدی ہے لیکن ایک ہی وقت میں متضاد اطلاعات، ہدایات اور خواہشات کے ہجوم میں خود جنرل عثمانی کے ذہن میں اس وقت کیا ہل چل مچ رہی ہو گی؟ اس کا ذکر کتاب میں نہیں ملتا، البتہ وہ ایک مختصر جملہ جو انھوں نے جنرل محمود سے کہا تھا، ان کے ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، یعنی 'جنرل مشرف کی ہدایات پر عمل درآمد ہو گا۔'

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کراچی کے برعکس راولپنڈی میں لوگوں کا ذہن ابھی واضح نہیں تھا وہ خاص طور پر جنرل محمود کا جو جنرل مشرف کے کراچی میں اترنے اور ان کے مقدر کے فیصلے کے انتظار میں تھے۔ یہی وجہ رہی ہوگی کہ جب جنرل عثمانی نے جنرل محمود سے سوال کیا کہ انھوں نے اپنی طرف کیا اقدامات کیے ہیں تو انھوں نے نفی میں جواب دیا لیکن جب انھیں یقین آ گیا کہ جنرل عثمانی مکمل طور پر جنرل مشرف کے ساتھ ہیں اور حرکت میں آ چکے ہیں تو وہ بھی متحرک ہو گئے۔

جنرل عثمانی کی کراچی ایئر پورٹ آمد اور جنرل مشرف کی پریشانی

راولپنڈی اور کراچی کے درمیان رابطوں کے دوران ہی جنرل عثمانی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ آئی جی سندھ رانا مقبول اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اکبر آرائیں وہاں پہلے ہی موجود تھے اور آپس میں محو گفتگو تھے۔

’ہمیں ایئر پورٹ کا کنٹرول سنبھال لینا چاہیے۔‘ آئی جی نے اپنے نائب کو ہدایت کی۔

’میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں کیونکہ فوج کے دستے یہاں موجود ہیں، اس لیے خطرہ ہے کہ کارروائی کے دوران کہیں تصادم نہ ہو جائے۔‘ ڈی آئی جی نے مشورہ دیا۔

جنرل عثمانی کے کان میں جیسے ہی یہ مکالمہ پڑا وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئے۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ پولیس کے اعلیٰ حکام اسی تاثر میں رہیں کہ فوج کی بھاری تعداد یہاں موجود ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اسی دوران انھوں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل افتخار سے فون پر رابطہ کر کے انھیں دستوں سمیت ایئر پورٹ پر جلد پہنچنے کی ہدایت کی۔ جنرل عثمانی ایئر پورٹ کے راستے میں بھی ایک بار رابطہ کر کے انھیں یہ ہدایت کر چکے تھے لیکن ان کی ابھی تک یہاں آمد نہیں ہو سکی تھی۔

جنرل عثمانی جنرل افتخار سے بات کر کے فوری طور پر ایئر ٹریفک کنٹرول پہنچ گئے۔ اسی دوران جنرل افتخار بھی وہیں پہنچ گئے۔ ایئر ٹریفک کنٹرولر یوسف عباس نے جنرل افتخار کو بتایا کہ انھیں ہدایت کی گئی ہے کہ جہاز کا رُخ نواب شاہ کی طرف موڑ دیا جائے۔ جنرل افتخار نے اپنا پستول نکال کر اُن کی گردن پر رکھا اور حکم دیا کہ وہ پائلٹ سے ان کی بات کروائیں۔

جنرل افتخار کے سٹاف افسر نے جنرل عثمانی کو نواب شاہ والی اطلاع فراہم کی تو انھوں نے نواب شاہ رابطہ کر کے متعلقہ یونٹ کو وہاں پہنچنے کی ہدایت کی لیکن وہاں متعین فوجی دستوں اور ایئر پورٹ کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے ان کا وہاں بروقت پہنچنا ممکن نہ تھا جب کہ پولیس کی بھاری جمعیت نواب شاہ ایئر پورٹ پر موجود تھی جسے ہدایت تھی کہ جیسے ہی طیارہ اترے پرویز مشرف کو گرفتار کر لیا جائے۔

اس ہنگامی کیفیت میں فوری فیصلے کی ضرورت تھی کیونکہ جہاز نواب شاہ پہنچتا تو جنرل مشرف کی گرفتاری یقینی تھی، لہٰذا انھوں نے طیارے کا رُخ کراچی کی طرف موڑنے کی ہدایت کی۔ اس دوران میں انھوں نے جنرل مشرف کو کاک پٹ میں بلا کر انھیں بھی صورتحال سے آگاہ کر دیا اور انھیں تسلی دلائی کہ حالات کنٹرول میں ہیں۔ جنرل مشرف اور جنرل افتخار کے پرانے گھریلو تعلقات تھے، اس لیے انھوں نے جنرل افتخار سے اپنے کتوں کے نام معلوم کر کے مزید تسلی کر لی کہ انھیں کہیں دھوکا تو نہیں دیا جا رہا، یوں جہاز بحفاظت کراچی میں اتر آیا۔ جہاز لینڈ ہوا تو یہ جنرل مشرف ہی تھے جو سب سے پہلے باہر آئے، جنرل عثمانی اور دو تین دیگر مسلح افسروں نے سیلوٹ کر کے ان کا خیر مقدم کیا لیکن جنرل مشرف اس کے باوجود پر اعتماد نہیں تھے۔

کچھ سوچ کر انھوں نے جنرل عثمانی سے سوال کیا کہ جہاز میں ان کی اہلیہ بھی موجود ہیں کیا وہ طیارے سے باہر آ سکتی ہیں؟ جنرل عثمانی کا جواب اثبات میں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے سٹاف افسر میجر ظفر کو ہدایت کی کہ وہ بیگم صاحبہ کو طیارے سے باہر لائیں۔

اس دوران وہ جنرل مشرف کو لے کر وی آئی پی لاؤنج پہنچ گئے جہاں تازہ دم ہونے کے لیے وہ فوراً ہی واش روم چلے گئے۔ جنرل مشرف جیسے ہی فریش ہو کر باہر آئے، جنرل عثمانی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی اور انھوں نے کہا: ’مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے۔‘ یہ سُن کر جنرل مشرف کے چہرے پر پریشانی عیاں ہو گئی، اُن کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے جنرل عثمانی نے فوراً ہی انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا: ’بے فکر رہیں سر! حالات قابو میں ہیں۔‘ اس کے بعد وہ انھیں باہر لائے اور انھیں ان کی گاڑی پر سوار کرا دیا، گاڑی پر چیف آف آرمی سٹاف کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گویا ایک مرحلہ کامیابی سے طے ہو چکا تھا، اب ایک نئی مہم درپیش تھی۔

جنرل مشرف کا قوم سے خطاب

کور ہیڈ کوارٹر پہنچنے تک جنرل پرویز مشرف اپنے ذہن میں بہت سے فیصلے کر چکے تھے چنانچہ انھوں نے وہاں پہنچتے ہی ہدایت کی کہ ان کا خطاب نشر کرنے کے انتظامات کیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے آئی ایس پی آر کی مقامی قیادت یعنی کرنل اشفاق حسین کی تلاش شروع ہوئی، وہ ابتدائی چند گھنٹوں تک راولپنڈی میں آئی ایس پی آر کی مرکزی کمانڈ سے ہدایات حاصل کرنے کے لیے رابطوں کی کوشش میں ناکامی کے بعد کور کمانڈر کی رہائش گاہ فلیگ سٹاف ہاؤس اور آرمی ہاؤس سے ہوتے ہوئے کور کمانڈر آفس پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ تقریر لکھی جا رہی ہے، چنانچہ وہ اسے نشر کرانے کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔

انھوں نے پی ٹی وی کو ریکارڈنگ ٹیم کور ہیڈ کوارٹر بھیجنے کی ہدایت تو ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز اطہر وقار عظیم نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے اگر وہ خود وہاں پہنچ کر اس کے انتظامات کریں۔

اس وقت فوج نے پی ٹی وی کراچی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اس صورت حال میں کسی کا اندر جانا اور باہر نکلنا ناممکن تھا۔ کرنل اشفاق وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹی وی کا عملہ گذشتہ کئی گھنٹوں سے وہاں بھوکا پیاسا محصور تھا، انھوں نے غیر ضروری عملے کے وہاں سے نکلنے کے انتظامات اور دیگر لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کیا اور ہدایت کی کہ ٹیلی ویژن سے یہ اعلان نشر کیا جائے کہ جنرل مشرف کچھ دیر کے بعد قوم سے خطاب کریں گے۔

اطہر وقار عظیم نے اس سے معذوری کا اظہار کیا اور بتایا کہ ٹی وی کا سگنل بند ہے، اس لیے وہ کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ چند منٹ کے رابطوں کے بعد کرنل اشفاق ٹیلی ویژن کی

نشریات بحال کرانے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح جنرل مشرف کے خطاب کی اطلاع نشر کرنے کی راہ میں یہ حائل رکاوٹ دور ہو گئی۔

اعلان نشر کرنے کا انتظام تو ہو گیا لیکن اب ان لوگوں کے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا کہ جنرل مشرف کس حیثیت سے قوم سے خطاب کریں گے؟ کرنل اشفاق نے لکھا ہے کہ جب وہ کور ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت تک یہ سوال ان کے سامنے نہیں تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اب فیصلے کی تمام تر ذمہ داری اُن پر آ پڑی ہے۔

اس مرحلے پر اُن کے ذہن میں کئی قسم کے خیالات نے یلغار کی، جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے: 'چیف (جنرل مشرف) مزید چیف نہیں رہے تھے، وزیر اعظم انھیں برطرف کرنے کے اہل تھے تو اب ان کی حیثیت ہے تو ریٹائرڈ چیف آف آرمی سٹاف کی۔ اصل پوزیشن کیا ہے؟ اگر ڈی جیور (قانونی حیثیت سے) نہیں تو حقیقی طور پر (ڈی فیکٹو) چیف تو ہیں۔ کور ہیڈ کوارٹر جا کر کسی سے مشورہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ہمارے سوال پوچھنے پر جی ایچ کیو میں جج ایڈووکیٹ جنرل برانچ سے رابطہ کیا جاتا تھا اور پھر ایک لمبی بحث چھڑ جاتی۔ قوم یہ جاننے کی منتظر تھی کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو گیا ہے۔'

وہ مزید لکھتے ہیں کہ 'ہم شاید مارشل لا کے نفاذ میں تاخیر تو کر سکتے تھے۔ ماضی میں اس کی مثال موجود تھی جب چیف نے چیئرمین سینیٹ کو دعوت دی کہ وہ صدر کا عہدہ سنبھال لیں۔ شاید اب بھی ایسا ہو جائے؟ ہم نے سوچا، چلیں، چیف کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا موقع دیتے ہیں شاید دانائی غالب آ جائے۔' خیالات کا یہ سلسلہ تھا تو وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے، انھوں نے ہدایت کی کہ صرف اتنا اعلان نشر کیا جائے: 'چیف آف آرمی سٹاف قوم سے خطاب کریں گے۔' عام حالات میں اگر ایسی اطلاع زبانی بھی دی جاتی تو کافی ہوتا لیکن اس وقت صورت حال غیر معمولی تھی اور ٹیلی ویژن والے بہت محتاط تھے، یہی سبب تھا کہ انھوں نے اعلان کی عبارت لکھ کر دینے کا مطالبہ کیا۔

کرنل اشفاق نے یہ اعلان جب اپنے ہاتھ سے لکھ کر ان کے حوالے کیا تو اس پر دستخط کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا جسے پورا کر کے اعلان کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کی گئیں۔ کرنل اشفاق ٹیلی ویژن کی ٹیم لے کر کور ہیڈ کوارٹر پہنچے اور ریکارڈنگ کے انتظامات شروع کر دیے گئے، اس دوران میں تقریر بھی تیار ہو چکی تھی۔ تقریر کرنل اشفاق کے حوالے کی گئی کہ ایک نگاہ وہ بھی اس پر ڈال لیں۔

یہ تقریر کیسے لکھی گئی؟ جنرل مشرف نے اپنی کتاب 'سب سے پہلے پاکستان' میں لکھا ہے کہ میں نے تقریر اپنے ہاتھ سے لکھنی شروع کر دی، جب وہ مکمل ہو گئی تو ساتھیوں نے اس کی منظوری دے دی۔ یہ ساتھی کون تھے؟ کتاب ان کے بارے میں خاموش ہے۔

کرنل اشفاق نے مجھے (عادل فاروق) کو بتایا کہ یہ تقریر منگلا کور سے تعلق رکھنے والے ایک میجر جنرل اقبال نے لکھی تھی۔ یہ فوجی انداز میں لکھی گئی ایک تحریر تھی جسے تقریر کی زبان میں بدلنے کے لیے کافی محنت کی ضرورت تھی۔

کرنل اشفاق نے جنرل عثمانی کو اپنی رائے بتائی تو انھوں نے کہا کہ فوراً نئی تقریر لکھ دو جس پر انھیں بتایا گیا کہ یہ کام وقت طلب ہے اور اگر انھوں نے تقریر جلد تیار کر لی تو بھی اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہو گی، نئی تجاویز سامنے آئیں گی اور اس طرح بہت تاخیر ہو جائے گی اور قوم انتظار کی سولی پر ٹنگی رہے گی۔

'پھر کیا کیا جائے؟' جنرل عثمانی نے الجھ کر سوال کیا۔

اس پر کرنل اشفاق نے تجویز پیش کی کہ اکٹھے بیٹھ کر تقریر تیار کر لی جائے۔ اکٹھے سے ان کی مراد یہ تھی کہ اس میں تین افراد شامل ہوں یعنی جنرل پرویز مشرف، جنرل مظفر عثمانی اور کرنل اشفاق۔ تجویز سے اتفاق کر لیا گیا۔

جنرل عثمانی نے جنرل مشرف کو اس تجویز سے آگاہ کیا تو انھوں نے بھی اسے پسند کیا لیکن جب یہ لوگ تقریر لکھنے بیٹھے تو ایک چوتھا شخص بھی درمیان میں موجود تھا۔ یہ صاحب منگلا کور کے میجر جنرل اقبال تھے جنھوں نے تقریر کا پہلا مسودہ تیار کیا تھا۔ اس تقریر کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اور اس کے بعد اللہ اکبر لکھا گیا تھا۔

یہ چاروں افراد ایک برج (Bridge) ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ جنرل مشرف کے عین سامنے کرنل اشفاق تھے، دائیں جانب جنرل عثمانی اور ان کے سامنے جنرل اقبال۔ سب لوگ بیٹھ گئے تو کرنل اشفاق سے کہا گیا کہ اپنے اعتراضات بیان کریں۔

کرنل اشفاق نے پہلا پیراگراف پڑھا اور اس پر اعتراض کیا کہ اوّل تو یہ تقریر کی زبان نہیں اور دوسرے اس کا لب و لہجہ عوامی کے بجائے فوجی ہے جس کے مخاطب فوجی تو ہو سکتے ہیں، عام شہری نہیں۔

جنرل اقبال نے ان اعتراضات کے رد اور اپنی تقریر کے دفاع میں بات شروع کی تو جنرل مشرف نے کرنل اشفاق کے اعتراضات کو درست قرار دے کر جنرل کو خاموش کرا دیا۔ اس کے بعد کرنل اشفاق نے وہیں بیٹھے بیٹھے متبادل پیراگراف لکھ کر سنایا، جنرل مشرف نے اس کی منظوری دے دی۔

اس طرح پہلی تقریر کے ابتدائی چار پیرے مسترد اور متبادل پیرے یکے بعد دیگرے منظور ہو گئے تو جنرل اقبال میز سے اٹھ کر کمرے کے ایک طرف کھڑے بعض دیگر افسروں میں شامل ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد کمرے سے بھی باہر چلے گئے۔

اس دوران میں ایک ایک پیرا کر کے کرنل اشفاق تقریر لکھتے چلے گئے اور اس کی منظوری ملتی چلی گئی۔ اب تقریر ریکارڈنگ کے لیے تیار تھی لیکن اب سوال یہ درپیش تھا کہ جنرل صاحب کس لباس میں تقریر ریکارڈ کرائیں گے؟

جنرل صاحب اس وقت غیر فوجی لباس میں تھے، فیصلہ ہوا کہ وہ کمانڈو کی وردی میں قوم کے سامنے آئیں گے، چنانچہ کسی کمانڈو کو تلاش کر کے اس کی جیکٹ لی گئی جو جنرل صاحب کے سائز سے کافی بڑی تھی، جسے کلپ لگا کر ان کے جسم کے برابر کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش ناکام ہو گئی کیوں کہ جیکٹ کا سائز ان کے جسم سے بہت ہی بڑا تھا جس کا اندازہ پہلی ہی نگاہ میں ہو گیا۔

یونیفارم پر اسے پہننے والے کا نام بھی ہوتا ہے، جنرل صاحب کی یونیفارم پر ان کا پورا نام ہوتا

تھا یعنی انگریزی میں پرویز مشرف، اس وقت یہ مکمل نام دستیاب نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا وہاں پرویز نام کے کسی فوجی کا بیج حاصل کیا گیا، یہ نمائندہ اس تقریر کے چند روز کے بعد کسی کام سے آرمی ہاؤس کراچی گیا تو وہاں ایک افسر نے اپنے میز کی دراز سے یہ بیج اسے نکال کر دکھایا۔ جنرل مشرف یہ تقریر لے کر کور کمانڈر کے دفتر میں چلے گئے جہاں ریکارڈنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔ جنرل صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ تقریر کا پہلا پیرا بطور ریہرسل پڑھ دیں۔ جنرل مشرف نے اسے پڑھا تو ان کے لہجے پر سفر کی تھکن اور اعصابی دباؤ کے آثار نمایاں تھے۔

یوں کرنل اشفاق اب ایک اور مشکل مرحلے سے دوچار ہو گئے، فوج کے سربراہ کے سامنے اور وہ بھی ایسا جو اب ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، یہ کہنا آسان نہ تھا کہ وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہیں، اس کے باوجود وہ آگے بڑھے اور انھوں نے جنرل مشرف سے درخواست کی کہ ان کے لیے جوس منگوا لیا گیا ہے براہ کرم وہ اس سے لطف اندوز ہوں اور اپنے لہجے میں توانائی پیدا کرنے کے بعد ریکارڈنگ کرانے کی ایک کوشش اور کریں۔

جنرل صاحب اس مطالبے پر چونک گئے اور سوالیہ نگاہوں سے جنرل عثمانی کی طرف دیکھا۔ جنرل عثمانی نے شانے اچکائے اور کیمروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ وقتی طور پر تو یہی لوگ اتھارٹی ہیں۔ جنرل مشرف کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے اعتماد کے ساتھ تقریر ریکارڈ کرائی۔

ریکارڈنگ مکمل ہونے پر ایک اور مشکل مرحلہ پیش آ گیا۔ آخری پیراگراف میں ان سے دو الفاظ کی ادائیگی کے دوران فنبل ہو گئے تھے جسے کرنل اشفاق نے محسوس کیا یا پھر اطہر وقار عظیم نے۔ جنرل صاحب کو آگاہ کیا گیا تو انھوں نے ذرا گھبراہٹ سے پوچھا کہ کیا پوری تقریر دوبارہ ریکارڈ ہو گی؟ انھیں بتایا گیا نہیں، صرف آخری پیرا۔ یوں انھوں نے مطمئن ہو کر یہ پیرا دوبارہ ریکارڈ کرا دیا۔ رات ایک بج کر چالیس منٹ پر یہ مہم سر ہوئی تاہم جنرل مشرف نے لکھا ہے کہ ایسا ڈھائی بجے شب ہوا تھا۔ ریکارڈنگ مکمل ہوئی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ایک امتحان ابھی باقی تھا۔ ٹیلی ویژن کا ایک افسر کرنل اشفاق کے پاس آیا اور سوال کیا کہ تقریر نشر کرتے وقت کیا پروٹوکول اختیار کیا جائے گا؟... 'کیسا پروٹوکول؟'... 'کیا قومی ترانہ بجایا جائے گا؟'... یہ ایک نہایت پیچیدہ اور خطرناک سوال تھا۔ کرنل اشفاق نے انھیں بتایا کہ جنرل صاحب ابھی صرف چیف آف آرمی سٹاف ہیں، لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ قومی ترانہ نا بجایا جائے، یوں یہ تمام مراحل مکمل کرنے کے بعد یہ تقریر رات دو بج کر ۴۵ منٹ پر نشر کرنے کی نوبت آئی۔ کرنل اشفاق کہتے ہیں کہ ایک علامت کے طور پر قومی ترانے کے نہ چلائے جانے اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے بجائے صرف آرمی چیف کی حیثیت سے اُن کی تقریر کے نشر کرانے کے پس پشت ایک حکمت یہ بھی پوشیدہ تھی کہ ممکن ہے کہ آگے چل کر دانائی غالب آ جائے اور ۱۷ اگست کے واقعے میں جنرل اسلم بیگ نے جیسے چیئرمین سینیٹ کو صدارت کا منصب سنبھال کر مارشل لا کا راستہ روکا تھا، ایسی ہی کوئی صورت اب بھی پیدا ہو جائے... لیکن جنرل مشرف نے اپنی تقریر میں اپنے لیے چیف ایگزیکٹو کے عہدے کا اعلان کر کے یہ راستہ بند کر دیا اور یوں قوم ایک ایسے سفر پر ایک بار پھر گامزن ہو گئی جس کا تجربہ اسے پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔

❁❁❁

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

انتخاب من التجاء

ساغر صدیقی

پت جھڑ میں بہاروں کی فضا ڈھونڈ رہا ہے
پاگل ہے جو دُنیا میں وَفا ڈھونڈ رہا ہے

خُود اپنے ہی ہاتھوں سے وہ گھر اپنا جلا کر
اَب سر کو چُھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہا ہے

کل رات کو یہ شخص ضیا بانٹ رہا تھا
کیوں دِن کے اُجالے میں دِیا ڈھونڈ رہا ہے

شاید کے ابھی اُس پہ زوال آیا ہوا ہے
جگنُو جو اندھیرے میں ضیا ڈھونڈ رہا ہے

کہتے ہیں کہ ہر جاہ پہ موجود خُدا ہے
یہ سُن کے وہ پتھر میں خُدا ڈھونڈ رہا ہے

اُسکو تو کبھی مُجھ سے محبت ہی نہیں تھی
کیوں آج وہ پھر میرا پتا ڈھونڈ رہا ہے

کس شہرِ مُنافق میں یہ تم آ گئے ساغر
اِک دُوجے کی ہر شخص خطا ڈھونڈ رہا ہے

صادقین نے اپنی اماں کی تصویر بنائی

تحریر: حکیم فاروق سومرو

صادقین کا عشق برش اور رنگوں سے کچھ یوں تھا کہ خواہ وہ کھانے کا وقفہ ہو یا دو گھڑی کسی سے بات کرنے میں انتظار طلب ہوجاتا تو ہاتھوں کی بے چینی ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی اور اگر ایک بار کام شروع ہوجاتا تو بیچ میں وقفہ آنا انتہائی مشکل ہوتا تھا۔ ہاں اگر کبھی امّاں سے چھیڑ خانی کا موڈ ہو تب ہی کام تھوڑا رک پاتا تھا۔

ایسا ہی ایک دن تھا جب صادقین اپنی اماں کے پاس آئے لیکن انہیں نماز میں مشغول پا کر وہیں پاس پڑے موڑھے پر براجمان ہوگئے۔ ہاتھوں کی گدگداہٹ چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ٹکٹکی باندھے اماں کو نماز پڑھتے دیکھتے رہے۔ اچانک کاغذ پر لکیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ صادقین بھی مصروف ہوگئے، اماں تو تھیں ہی بارگاہِ الٰہی میں مشغول۔ جب تک اماں کے وظیفے ختم ہوئے اس وقت تک بیٹا بھی اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کر چکا تھا۔

اماں: (ٹانگوں کو سیدھا کرتے ہوئے جس میں جوڑوں کے درد نے بسیرا کر رکھا تھا۔) کب سے بیٹھا ہے؟ صادقین: (اپنی انگلیوں کو چٹخاتے ہوئے) ارے خوب بیٹھا اماں، آج اللہ میاں سے دوستی کا ہے کو بڑھالی؟ (انداز کچھ شوخ سا ہو چلا تھا)

اماں: (انکساری سے) ارے کہاں مجھ حقیر میں اتنی طاقت کہ دوستی بڑھالوں اللہ سے، میری تو اس عبادت میں بھی غرض شامل ہے۔ صادقین: (مزید شوخ ہو کر) کیوں کیا جنت کی بکنگ کرا ڈالی؟ اماں: (شرارت کو سمجھ گئیں تھیں، شرما کر بولتی ہیں) اے ہٹ! میں تو یوں لمبے وظیفے کھینچ رہی تھی کہ بیٹے کو دو گھڑی سکون کے مل جاویں۔ تو یہاں بیٹھا رہا تو میں نے سوچا چین سے بیٹھا ہے کچھ گھڑی اور بیٹھ لے۔ ورنہ وہ تیرے اللہ مارے روغن۔ دیکھ کتنا کمزور ہوگیا ہے۔ (اماں کی آواز میں اب فکر آگئی) رات کو جو دودھ جلیبی بھگو کر رکھی وہ کھائی یا نہیں؟ میں کیا جانوں نہ ہوں، نہ کھانے کا ہوش ہو گا نہ پینے کا۔ کیسی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔

صادقین: (آواز میں شوخی ہے انداز میں شرارت) اماں مت پوچھو (پیرس میں) کیا مزے تھے۔ صبح کو چھ بجے سو کر اور دن کو چار پانچ کے درمیان اٹھ کر بیڈ کافی پیتے۔ میں بڑے اطمینان سے شاعری کرتا تھا اور یقین جانو کہ تمہیں اطمینان دلانے کو بس اتنا ہی رہ گیا تھا کہ جو ایک کاٹس نامی فرانسیسی دوست کراچی آیا تو یہ خیال آیا کہ سیر بھر گوشت روانہ کر دیا جائے تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے کہ وہاں گوشت کیسا ہوتا ہے۔ مگر سوچا وہ ہنسے گا کہ یہ کیا بھیج رہا ہوں۔ سچ پوچھو تو امروہہ میں روٹی بوٹی سے ایک یا دو دن بعد جو بچے پکا کرتے تھے وہ یاد آجاتے تھے اور تو اور ترکاریاں بھی ایسی ہوتیں کہ بہترین بلور کے گلدان میں پھولوں کا گلدستہ لگانے کی بجائے اگر ان کو لگا دیا جاتا تو کچھ کم خوبصورت معلوم نہ ہوتیں۔ سو بھلا میں کسی وقت بھی کھانے کا ناغہ کیوں کرتا؟

اماں کے چہرے پر یہ سن کر کچھ اطمینان کے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں مگر بیٹے کی بات پر

اعتبار نہیں۔ اماں: اے ایسے کہے ہے جیسے میں کچھ ہی نہ جانتی۔ کچے گوشت کا کیا بتائے ہے، کیا بس بوٹیاں تاک کر ہی پیٹ بھر لیتا تھا؟

صادقین: (اماں کے چھوٹے اور بڑے کے گوشت کی اقسام پر گہری نظر جانتے ہوئے چھیڑنے کے انداز میں) ہاں اگر تم سن اکتیس میں چھدا بھیا کے لائے گوشت سے موازنہ کرتیں تو شاید پسند نہ آتا۔ ارے تو پیرس میں تھا امروہہ میں تھوڑی۔ مگر اماں تم ہی کہو چاہے گوشت بڑے دربار سے ہی کیوں نہ آتا تھا چھدا کے لائے گوشت کی کوالٹی ہر سال گرتی جا رہی تھی۔ یاد ہے جو ایک دن یہ بھی آیا تھا کہ گوشت کی سِک نہیں مڑی رہ گئی۔ جب گوشت چھدا لایا تھا تو گلنا چاہیئے تھا! مگر نہیں! بالکل نہیں! سِک نہیں مڑی! اماں بہت سنجیدگی سے اس بات کا جواب دیتی ہیں اور صادقین فقط اماں سے لچھے دار باتیں کر کے بات برائے بات کر رہے ہیں۔ اماں: اے نہ! وہ بیچارے چھدے کا قصور نہ تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے بہترین گوشت لا رہا تھا۔ ساری وجہ تو اللہ ماری دوسری جنگ عظیم کی تھی۔ ارے جب گئیاں ہی سوکھ گئی تھیں۔ چھدا تو ان کو تر و تازہ گھاس کھلاتا تھا۔ مگر جب ہندوستان میں گھاس ہی نہ چھوڑی اللہ مارے انگریزوں نے، تو بھلا چھدے کو کیا الزام دیں۔

صادقین: (ہنسی روکتے ہوئے) اماں صحیح کہتی ہو یہ بیچارے چھدا بھیا کا قصور نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی انحطاط پذیر معیشت کی روداد ہے اور انگریز کے عقلمندانہ طور سے ہندوستان چھوڑ دینے کا راز بھی اس میں مضمر ہے۔ اس میں نہ گاندھی کی اہنسا کو دخل ہے نہ مولووُف (یعنی پبلک اوپینین) نہ مسلم لیگ، کسی کو بھی نہیں۔ چھدا بھیا کے لائے ہوئے گوشت میں سال بہ سال خرابی کی وجہ ہندوستان کی انحطاط پذیر معیشت تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگریز نے خوشی سے ہندوستان چھوڑ دیا۔

صادقین دوران گفتگو بارہا اپنے پاس پڑے کاغذ پر پین سے کچھ لکیریں مارتے اور پھر اماں کی طرف دیکھنے لگتے اور ساتھ ہی کاغذ کو اماں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اماں کا رخ

پاندان کی طرف تھا اور اس اہم ڈسکشن کے دوران کئی مرتبہ تمباکو پھانک چکی تھیں کہ یکایک نظر بیٹے کے ہاتھ میں پینسل پر پڑی اور کاغذ پہ کوئی تصویر جھانکتی دکھائی دی۔

اماں: ہائیں یہ کیا ہے؟ کیا بناڈالا اتنی دیر میں؟ میں سمجھی کہ تو چین سے بیٹھا ہے، تو نے اتنی دیر میں دوسرا کاغذ کالا کر ڈالا بابو۔ آئے کیا ہے یہ آخر؟

صادقین: (شرما کر) ارے اماں! تمہاری تصویر بنائی ہے۔ دیکھو اماں برا مت مانیو! میں نے تو بس ایسے ہی........ جب کبھی تم سے دور اڑد کی کھچڑی اور شلجم کا اچار یاد آئے گا تو اسے دیکھ لیا کروں گا۔ اماں کو یکایک بیٹے پر ایسا پیار آتا ہے کہ تخت سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور صادقین کا ماتھا چوم لیتی ہیں۔...اماں: (جذباتی ہو کر)

پروردگار چودہ معصومین کے صدقے میں تجھے کامیاب کرے!

لوگ یہ تصویر دیکھیں تو کہیں صادقین کی ماں کی تصویر ہے!

خوب نام روشن ہو میرے چاند کا!

اب بتا کیا کام تھا؟

صادقین: (بڑے ناز سے) ایک پیالی چائے پلا دو۔

اماں: ابھی لائی میرا چاند ابھی لائی۔

یوں اماں پاؤں میں چپل ڈال کے باورچی خانے میں برتنوں کی کھٹ پٹ میں بیٹے کی چائے کا بندوبست کرنے لگیں اور صادقین بیٹھے سوچتے رہے کہ اماں کی دعا کا کیا اثر ہوگا؟ کیا رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہے گا؟ ❁❁❁

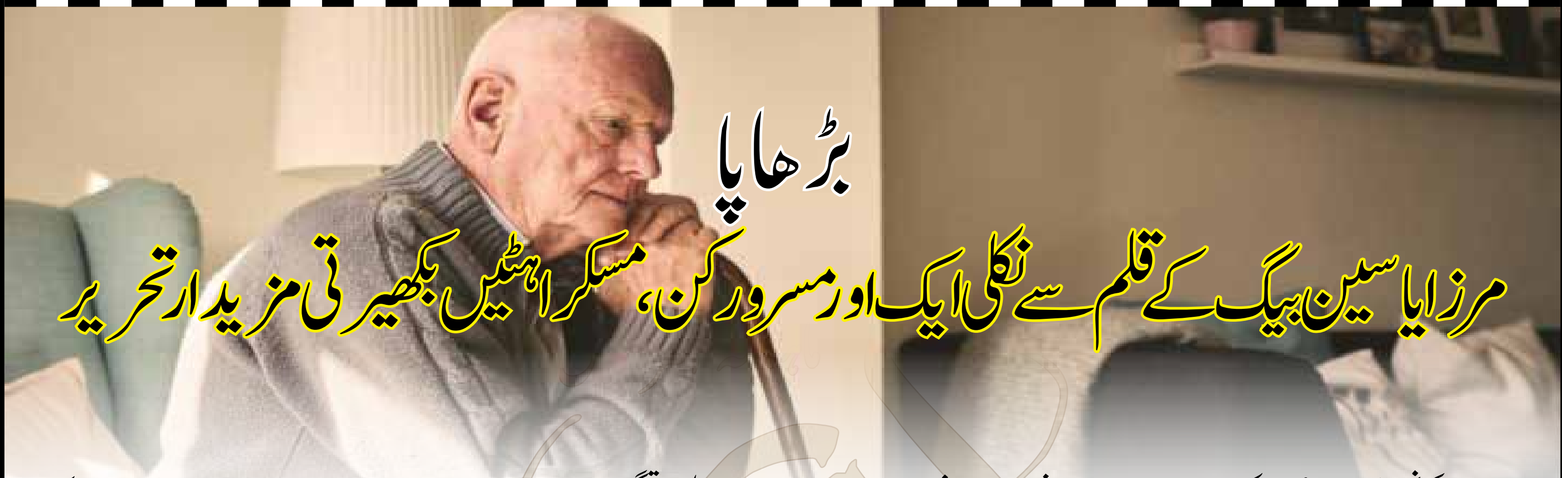

بڑھاپا

مرزا یاسین بیگ کے قلم سے نکلی ایک اور مسرور کن، مسکراہٹیں بکھیرتی مزیدار تحریر

بڑھاپا پوچھ کر نہیں آتا اور نہ ہی دھکے دینے سے جاتا ہے۔ یہ مشرق میں مرض اور مغرب میں زندگی انجوائے کرنے کا اصل وقت سمجھا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں دانت جانے لگتے ہیں اور دانائی آنے لگتی ہے۔ اولاد اور اعضاء جواب دینے لگتے ہیں۔ بیوی اور یادداشت کا ساتھ کم ہونے لگتا ہے۔ بڑھاپا آتا ہے تو مرتے دَم تک ساتھ نبھاتا ہے۔

بڑھاپے کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ حسین لڑکیاں 'انکل' کہہ کر پکارنے لگتی ہیں۔

انسان دو چیزیں مشکل سے قبول کرتا ہے، اپنا جرم اور اپنا بڑھاپا۔ ہمارا بچپن دوسروں کی دلجوئی اور خوشی کے لئے ہوتا ہے۔ جوانی صرف اپنے لئے ہوتی ہے اور بڑھاپا ڈاکٹروں کے لئے۔ جب بار بار اللہ، ڈاکٹر اور بیوی یاد آنے لگے تو سمجھ لیں آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بڑھاپے کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ بے ضرر ہوتے جارہے ہیں۔ اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

جب بچے آپ کو نانا، دادا کہہ کر اور حسین لڑکیاں انکل کہہ کر پکارنے لگیں تو تردد سے کام نہ لیں۔ تنہائی پاتے ہی غم بھلانے کے لئے سیٹی بجائیں، کیونکہ آپ سیٹی ہی کے قابل رہ گئے ہیں۔ بڑھاپے میں اگر اولاد آپ کی خدمت کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے ان کی تربیت اور اپنی لائف انشورنس پر پورا دھیان دیا ہے۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، یہ ایک نہیں ہزاروں بوڑھوں کا قول ہے۔۔ بوڑھا ہونا الگ چیز ہے، بوڑھا دکھائی دینا الگ ھر بوڑھے میں ایک بچہ اور جوان چھپا ہوتا ہے۔ بوڑھا ہونا آسان کام نہیں، اس کے لئے برسوں کی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

دنیا نہ چل پاتی اگر بوڑھے ہونے کا رواج نہ ہوتا۔ بڑھاپے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بوڑھے کو دیکھ کر سب سیٹ چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔ سوائے سیاست دان کے۔

اچھا خاندان اور اچھی حکومت ہمیشہ اپنے بوڑھوں کا خیال رکھتی ہے۔ بوڑھے نہ ہوتے تو چشموں اور دانتوں کا دھندا بالکل مندا ہوتا۔ بوڑھوں کو بندی اور خاندانی منصوبہ بندی دونوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ مگر نیت اور نظر پھر بھی خراب رہتی ہے۔

عورتیں بوڑھی تو ہوتی ہیں۔۔۔ مگر ان کی عمر اکثر جوانی والی ہی رہتی ہے۔

عورت اپنی عمر چھپاتی ہے نہ جسم۔۔۔ پاکستان میں جو عورت اپنی عمر پینتیس سال بتاتی ہے۔۔۔ وہ پچاس سال کی دکھائی دیتی ہے۔۔۔ دنیا میں سب سے آسان کام نانا، نانی یا دادا، دادی بننا ہے۔۔۔ اس میں آپ کو کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔۔۔

جو کچھ کرنا ہو، آپ کے بچوں کو کرنا پڑتا ہے۔ انسان کو زندگی میں دو بار رشتوں کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے، بیوی کے آنے کے بعد یا پھر بڑھاپا آنے کے بعد۔ ہر بچے کے اندر ایک بوڑھا چھپا ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ عمر لمبی پائے۔ کیا با کمال دور ہے یہ آغازِ بڑھاپا بھی۔۔۔ بچپن میں ہم ٹیسٹ دیا کرتے یا ٹیسٹ دیکھا کرتے تھے۔۔۔

اب ڈاکٹر ہمارے لئے ٹیسٹ لکھ رہا ہے۔ *ہر عمر رسیدہ کیلئے یہی پیغام ہے کہ دنیا سے انجوائے کریں قبل اس کے کہ دنیا آپ سے انجوائے کرے*

(منقول)

❁❁❁

نواز شریف کی وزارت عالیہ کے دور میں

(ثاقب زیروی کی یادیں)

نواز شریف کا دور وزارت عالیہ دراصل ملاؤں کا دور تھا جو ہوم سیکرٹری (پنجاب) کی مدد کرتے تھے اور جنہیں احمدیوں کی ہر حرکت زیرِ دفعہ ۲۹۸ سی نظر آتی تھی۔ ہوم سیکرٹری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھتے تھے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ متعلقہ تھانے کا لکھتے تھے۔ ایس ایچ او کی کیا مجال کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق ''ایف آئی آر'' نہ کاٹے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کے حکم کی تعمیل میں علامہ نیاز فتحپوری (مدیر شہیر ماہنامہ نگار لکھنؤ) کراچی کے ایک مضمون پر ۱۹۹۰ء کے نئے سال کی ابتداء ہی میں ثاقب زیروی (مالک وناشر ہفت روزہ ''لاہور'') اور طابع (میاں محمد شفیع عرف م۔ش) کے خلاف ایف آئی آر درج ہوئی۔ حکم تھا کہ ''ایف آئی آر'' درج کر کے اس کی نقل ان کے دفتر میں بھجوا دی جائے۔ اسی طرح ٦ جنوری ۱۹۹۰ء کو ایف آئی آر نمبر ٦ (۱۹۹۰ء) زیرِ دفعات ۲۹۵ الف، ۲۹۸ سی رت درج ہوئی جو ''لاہور'' کے شماروں (۲۷ مئی ۱۹۸۹ء۔ ۳ جون ۱۹۸۹ء۔ ۱۷جون ۱۹۸۹ء اور یکم جولائی ۱۹۸۹ء) سے متعلق تھی جن میں ملّاں حضرات کو ان جرائم کا ارتکاب نظر آیا تھا۔

''لاہور'' چونکہ تنہا نگارِ صحافت کا مجلّہ تھا اور م۔ش بیماری کے باوجود مجھ سے تعاون فرما رہے تھے اور پرچہ ہر کھینچا تانی کے باوجود چھاپ رہے تھے اس لئے ان کے لئے بھی وکلاء ضامنوں اور ضمانتوں کا اہتمام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ چونکہ ان دنوں اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر کو ہراساں کرنے کے لئے ضمانت طلبی کے نوٹسوں کی بھی بھرمار رہتی تھی اور اکثر ہر پندرہویں دن ہم دونوں کو چیف سیکرٹری۔ ہوم سیکرٹری کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ جو حاضری ہوئی تو اس کے خاتمے پر ''م۔ش'' صاحب کو ایک ''ذاتی گفتگو'' کے لئے روک لیا گیا۔ میری غیر حاضری میں جو بات چیف سیکرٹری صاحب اور م۔ش صاحب میں ہوئی۔ م۔ش صاحب نے مجھے راستے میں بتائی م۔ش صاحب نے بتایا کہ چیف سیکرٹری صاحب مجھ سے کہنے لگے۔

''مجھے تو شرم آتی ہے کہ آپ کو بار بار بُلواتے ہوئے۔ آپ یہ پرچہ چھاپنا ترک کیوں نہیں کر دیتے۔ خواہ مخواہ کیوں اذیت اُٹھا رہے ہیں؟ اور مَیں نے جواباً عرض کیا کہ ''لاہور'' کے معاملہ میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وکیل ایڈیٹر صاحب خود کرتے ہیں ضامن خود تیار کرتے ہیں ضمانت بھی خود کرواتے ہیں۔ اگر کہیں جانا پڑے تو مجھے ٹیوٹا میں بٹھا کر لے جاتے ہیں وہاں مرغ مسلّم سے میری تواضع کرتے ہیں۔ میرا کام تو اخبار اور دیگر دستاویز چھاپنا ہی ہے اس کے برعکس ''فلاں'' پرچہ میرے ہاں چھپتا ہے اس نے کوئی خط مردان کے کسی خاں کے متعلق چھاپ دیا جس نے ''ازالہ حیثیت عرفی'' کا استغاثہ دائر کر دیا (مردان میں) پولیس آئی اور مجھے اور ایڈیٹر صاحب کو ہتھکڑی پہنا کر لے گئی رات سول لائنز پولیس سٹیشن میں کٹی۔ صبح سویرے بس میں بیٹھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی وہ تو اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ مجسٹریٹ مجھے جانتا تھا اس نے فوراً ہماری ضمانت لے لی۔ ضامن بھی خود تیار کیے۔ اب بتائیے میں کس طرح ''لاہور'' چھاپنا بند کر سکتا ہوں۔''

لوئر مال پولیس سٹیشن والا کیس اے۔سی (صدر) کے پاس لگا تھا۔ ملاؤں کو تو احمدیوں کی ہر حرکت ۲۹۸ سی اور ۲۹۵ الف نظر آتی ہے اس لئے وہ ہوم سیکرٹری صاحب کو یہی مشورہ دیتے تھے اور ہمارے وکلاء کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ سب سے پہلے درخواست دیا کرتے تھے کہ صاحب یہ جرم تو بنتا ہی نہیں۔ چنانچہ لوئر مال کے کیس میں بھی ایسی درخواست دے دی گئی کہ میرے ایک مہربان نے مجھ سے ایک دن بڑے تذبذب سے کہا ماڈل ٹاؤن کا ''اے۔سی'' میرا مہربان ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے کہوں کہ وہ صدر کے اے۔سی صاحب سے بات کریں۔'' مَیں نے اجازت دے دی۔ دو ایک دن بعد وہ تشریف لائے تو مجھے بتایا کہ اے۔سی (صدر) صاحب نے جواب دیا کہ

''مقدمے میں تو کچھ نہیں ہے لیکن ثاقب زیروی ایک بڑا معروف احمدی ہے۔ اگر اسے چھوڑ دوں تو میں بھی احمدیوں کے ساتھ بریکٹ ہو جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے میں یہ کیس بھی کسی مجسٹریٹ کو منتقل کر دوں۔''

اگلے دن ہماری پیشی تھی گیارہ بجے دھوپ نے تنگ کرنا شروع کیا تو مَیں نے مکرم حمید اسلم قریشی صاحب (ایڈووکیٹ) سے کہا کہ ''بھائی ریڈر کو کچھ دے دلا کر تاریخ ہی لے لو۔ اے۔سی صاحب تو آنے سے رہے۔ وہ کہنے لگے ''مکرم مرزا نصیر احمد صاحب (ایڈووکیٹ) کو آنے دیجئے انہیں ان اہل کاروں سے معاملہ کرنا آتا ہے۔''

مرزا صاحب تشریف لائے تو ان سے ریڈر صاحب کو ملنے کے لئے کہا گیا وہ گئے اور چند منٹ بعد باہر آ گئے کہ کیس تو مجسٹریٹ جاوید اقبال صاحب کی عدالت میں منتقل ہو گیا ہے اور اے۔سی صاحب قبضہ گروپ والوں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا ضمیر تھا۔ اٹھائیس دن ضمانت نہیں ہوئی۔ جاوید اقبال صاحب ایسے مجسٹریٹ تھے جو علامہ نیاز فتح پوری کا وہ مضمون وعنوان ''تاریخ اسلام میں کنیزوں کا اقتدار'' شائع شدہ تھا۔ یہی مضمون ''لاہور'' ۲۲ جولائی ۱۹۸۹ء میں نقل ہوا تھا جس پر ملّا لوگ تاؤ کھا گئے۔ دوران سماعت ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جس سے مجسٹریٹ صاحب کی نیک نیتی ظاہر ہوتی تھی۔ مجسٹریٹ صاحب عدالت میں دس بجے کے قریب آنے کے عادی تھے جبکہ ہمیں ان کی عدالت میں ساڑھے سات بجے پہنچ جانا ہوتا تھا ایک دن جو مَیں کھڑا کھڑا تھک گیا تو

حمید اسلم قریشی صاحب ایڈووکیٹ نے مجھے عدالت میں ایک خالی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا مجسٹریٹ صاحب تشریف لائے مقدمات کی سماعت شروع ہوئی یہاں تک کہ ہماری باری آ گئی ہمارے وکلاء کے ساتھ ملزموں کو نہ دیکھ کر مجسٹریٹ صاحب نے سوال کیا کہ ”Accused کہاں ہیں۔“

مَیں اُٹھا اور سامنے آیا تو مجسٹریٹ صاحب بولے کہ ”آپ ملزم ہیں اور بیٹھ گئے ہیں“ مَیں نے عرض کیا کہ ”مَیں دراصل کھڑا کھڑا تھک گیا تھا قریشی صاحب کے کہنے پر بیٹھ گیا۔“ اتنے میں مرزا نصیر احمد صاحب نے حوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ ”یہ مجرم نہیں ملزم ہیں اور ملزم بیٹھ سکتا ہے۔“

شکر ہے کہ مجسٹریٹ صاحب نہ صرف رام ہو گئے۔ کسی قدر شرمندہ بھی ہوئے اور حکم کے لئے تاریخ بھی دے دی۔ جب ہم پہنچے تو وہ شیعہ کانفرنس میں ڈیوٹی کے لئے گئے ہوئے تھے اور پھر جو تشریف لائے تو ۳۰ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ثاقب زیروی اور م۔ش صاحب کو بری کر دیا۔

دوسرا مقدمہ ذرا دلچسپ تھا جو نیازی صاحب مجسٹریٹ کی عدالت میں تھا۔ جہاں تیس سیڑھیاں پھلانگ کر جانا پڑتا تھا۔ بیرسٹر مبشر لطیف صاحب نے نواب اوصاف علی خان صاحب ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سے ضمانتیں کروا دیں۔ مگر میرا بڑا لڑکا طاہر محمود احمد بہت مضطرب تھا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ ”مجسٹریٹ نیازی صاحب مولوی عبدالستار نیازی کے عزیز ہیں۔ وہ ش م صاحب کو تو رہا کر دیں گے کہ وہ مولوی عبدالستار نیازی کا دوست ہے مگر آپ کو سزا دے دیں گے۔“ میرا ہر دفعہ یہی جواب ہوتا تھا کہ

”جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو دھمکیوں کا کیا ڈر“

جو لوگ کریمینل مقدمات کی سماعت سے آگاہ ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ دو تین پیشیاں رسمی قسم کی ہوتی ہیں۔ تیسری پیشی پر ہمارے وکلاء یہ درخواست پیش کرنے والے تھے کہ م۔ش صاحب کو حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے کیونکہ وہ بیمار ہیں۔ معلوم ہوا کہ مقدمہ منتقل ہو گیا ہے اور سی ایس پی ”اے۔سی“ محترمہ ناہید شاہ جیلانی کی عدالت میں لگ گیا ہے۔ وکلاء نے جب باہر آ کر یہ بتایا تو میرے منہ سے بے ساختہ بلند آواز سے ”الحمدللہ“ نکلا جس پر م۔ش صاحب نے کہا۔ ”بھائی بڑے زور سے الحمدللہ کہا ہے۔“ مَیں نے جواباً عرض کیا کہ ”مجھے ”انجائنا“ کی شکایت ہے اور وہ عدالت سیڑھیوں والی نہیں ہے۔“

ہم اگلی پیشی پر محترمہ ناہید شاہ جیلانی کی عدالت میں جا پہنچے۔ نہ جانے کس شریف النفس کی بیٹی تھیں کہ ایک دفعہ بھی ملزموں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ملزمان کے وکلاء نے ضابطہ فوجداری کی ۲۴۹ الف کے تحت (حسب معمول) درخواست دے رکھی تھی بحث کے دوران ہمارے وکلاء (حمید اسلم قریشی صاحب اور مرزا نصیر احمد صاحب) نے نظائر پیش کئے۔ بالآخر مرزا نصیر احمد صاحب نے کہا کہ

”کسی اخبار یا ہفت روزہ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہفت روزہ ”لاہور“ کے ایڈیٹر اور پبلشر گو احمدی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا ہفت روزہ ”لاہور“ بھی احمدی ہے۔ یہ تو اکثر سکھوں، بوہروں، اسماعیلیوں اور زرتشتیوں کے مضمون چھاپتے رہتے ہیں حالانکہ یہ نہ سکھ ہیں نہ بوہرے نہ اسماعیلی اور نہ زرتشتی پھر دوسرے ملزم (م۔ش صاحب) مسلمان ہیں۔“

انہوں نے شائع شدہ مضامین کے متعلق وضاحت کی دوران سماعت ایک دن مجھے خواب میں نظر آیا کہ میں زیرہ ضلع فیروز پور میں ہوں سڑک ویران ہے اور اس پر ایک لمبا چوڑا ”سانپ“ چلا آ رہا ہے۔ اتفاق سے میرے دونوں وکیل میرے ساتھ ہیں اور مَیں ان سے کہتا ہوں کہ اس سانپ کو ماریں مگر وہ ایک بجیرو پر چڑھ جاتے ہیں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے اگلے دن مکرم حمید اسلم قریشی مرحوم مجھے لینے آئے کہ ”میں زیادہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔“ میں نے انہیں خواب سنائی اور کہا کہ

”اگر آج محترمہ نے فیصلہ سنایا تو ہمیں ”جرمانہ“ ضرور ہو گا۔ کیونکہ بہرحال ”سانپ“ دیکھا ہے اور اس کا خواب میں دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں“ مگر محترمہ نے ہمیں ایک ہفتے کی تاریخ دے دی یہ کہہ کر کہ ”میں تھک گئی ہوں آج فیصلہ نہیں سنا سکتی۔“

اگلے دن پھر قریشی مرحوم صاحب جب مجھے لینے آئے تو سب سے پہلا سوال کیا کہ کیا کوئی خواب آئی۔ عرض کیا۔ خواب آئی ہے اور مَیں نے اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ ہم آج ”بری“ ہو جائیں گے۔ کہنے لگے خواب تو سناؤ۔ مَیں نے کہا۔

”میں خواب دیکھتا ہوں کہ چند خدام میرے پاس آئے ہیں یہ خواہش لے کر کہ میں ان سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب کی باتیں کروں۔ انہوں نے گو کچھ نہیں کہا یہ میرا احساس ہے اور میں ان سے کہتا ہوں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا.......”ثاقب کل تمہارا یوم پیدائش ہے“ اور میری آنکھ کھل گئی اور میرے منہ سے نکلا کہ کل تو ہماری تاریخ ہے۔ اگلے ہی لمحے میرے دل نے کہا کہ پیدائش کے وقت تو انسان ”معصوم“ ہوتا ہے۔ گویا ہم بری ہو جائیں گے باعزت!“

جب ہم عدالت پہنچے تو اے۔سی صاحبہ نے ہمیں ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو بری کر دیا۔

اے۔سی صاحبہ شریف النفس تھیں۔ مَیں اکثر رکشہ پر اپنے دفتر جاتا ہوں۔ ایک دن جو میں دفتر جا رہا تھا تو سامنے سے ایک چھوٹی کار آ رہی تھی جس کی ڈرائیور کوئی خاتون تھیں مَیں نے رکشہ ڈرائیور سے کہا کہ ”تم مجھے یہیں اتار دو بیشتر اس کے کہ اس بی بی سے تمہاری ٹکر ہو جائے۔“ مَیں ہائی کورٹ کے ٹرنر روڈ والے دروازے سے ذرا پرے اتر گیا۔ مگر کار بھی رُک گئی اور اس میں سے وہی اے۔سی صاحبہ (ناہید شاہ جیلانی) نکل آئیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں! ”ثاقب صاحب آج آپ ہائی کورٹ میں پھر رہے ہیں؟“ ان کا خیال تھا کہ آج یہاں بھی ان کی کوئی پیشی ہے! میں نے عرض کیا

”بی بی یہاں گلیکسی لاء چیمبرز میں میرا دفتر ہے۔ میں اپنے دفتر جا رہا تھا۔“ تو مَیں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

بطن زمیں میں سینکڑوں خورشید ہیں پنہاں
کیوں اپنے دل سے عظمت انساں اٹھائیے

❋❋❋

ایران کے سپریم رہنما آیت اللہ علی خامنہ ای کی ذاتی زندگی، دولت اور مشاغل کی جھلکیاں

تحریر: نعمان فرید

آیت اللہ علی خامنہ ای جون ۱۹۸۹ میں آیت اللہ روح اللہ خمینی کے انتقال کے بعد سے ایران کی اسلامی انقلابی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے دار چلے آرہے ہیں۔ آئینی طور پر انہیں ولایت فقیہ کا منصب حاصل ہے یعنی امور مملکت میں ان کا حکم حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ۱۹۸۱ سے ۱۹۸۹ تک ایران کے صدر بھی رہے ہیں۔ گویا ایران میں فروری ۱۹۷۹ کے اسلامی انقلاب کے بعد سے انہیں مسلسل مقتدر ترین حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کے فرامین (احکامات) پر عمل درآمد کے لئے ایک خصوصی محکمہ تشکیل دیا گیا ہے جسے سرکاری طور پر ستاد اجرایی فرمان امام کہا جاتا ہے تاہم عام طور پر اس محکمے کو صرف ستاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہونے والے ولایت فقیہہ آیت اللہ علی حسینی خامنہ ای کی موجودہ عمر ۷۹ برس ہے اور انہیں ایران میں رسمی طور پر رہبر معظم کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

عام طور پر آیت اللہ علی خامنہ ای کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی سخت گیر تشریح کے قائل ہیں۔ تاہم مختلف اوقات میں ایرانی حکومت سے منحرف ہو کر بیرون ملک فرار ہونے والے سرکاری عہدے داروں کے مطابق آیت اللہ علی خامنہ ای کی بظاہر سادہ زندگی درحقیقت بے پناہ دولت، اختیار اور انتہائی قیمتی مشاغل سے عبارت ہے۔

ایک محتاط ترین اندازے کے مطابق ۲۰۱۳ء میں آیت اللہ علی خامنہ ای کی ذاتی دولت ۹۵ ارب امریکی ڈالر سے تجاوز کر چکی تھی۔ واضح رہے کہ فروری ۱۹۷۹ میں برسراقتدار آنے کے بعد ایران کی انقلابی حکومت نے سابق شاہ رضا پہلوی اور ان کی بیوی پر ۳۵ ارب ڈالر کے اثاثے رکھنے کا الزام عائد کیا تھا۔ کرنسی کی موجودہ شرح تبادلہ کے اعتبار سے بھی سابق شاہ کی مبینہ دولت کا تخمینہ ۷۹ ارب ڈالر تھا۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کی دولت کا بڑا حصہ "ستاد اجرایی فرمان امام" نامی محکمے کی مدد سے اندرون ملک مقیم کاروباری گھرانوں نیز بیرون ملک چلے جانے والے ایرانی شہریوں کی جائیدادوں پر زبردستی قبضہ کر کے ہتھیایا گیا ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر بہائی فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد اور گھرانوں کی دولت پر منظم طریقہ کار کے مطابق قبضے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

"ستاد اجرایی فرمان امام" محکمہ ایرانی معیشت کے ہر اہم شعبے بالخصوص بینکاری، خام تیل، ٹیلی کمیونیکیشن، سے لے کر شتر مرغ کی افزائش کے فارموں اور مانع حمل ادویات کی تیاری تک میں دخیل ہے۔ یہ محکمہ براہ راست آیت اللہ علی خامنہ ای کی نگرانی میں کام کرتا ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں مالی امور کے علاوہ سیاسی اختیارات سے متعلقہ امور دیکھنا بھی شامل ہے۔ اس محکمے کے اثاثوں کا حجم خام تیل میں ایران کی سالانہ برآمدات کے ۴۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ ستاد نے ملک کے مختلف حصوں میں سکول، شفاخانے اور سڑکیں بھی تعمیر کی ہیں تاہم یہ امر واضح ہے کہ یہ اخراجات ہتھیائے گئے اثاثوں کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کے ثبوت حاصل کرنا نہایت دشوار ہے کہ ستاد کی دولت کا کتنا حصہ براہ راست آیت اللہ علی خامنہ ای کی ملکیت ہے تاہم اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دولت اقتدار پر آیت اللہ علی خامنہ ای کی گرفت مضبوط رکھنے نیز ان کے سیاسی مخالفین کے خلاف موثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت اللہ علی خامنہ ای ستاد کے اثاثوں کے استعمال کے لئے پارلیمنٹ یا کسی دوسرے ادارے کی منظوری کے پابند نہیں۔ ان کے زیر استعمال مالی ذرائع کا قومی بجٹ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ان کی ذاتی سیاسی حیثیت اور معاشی اختیارات پر مختلف سیاسی گروہ بندیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کی ذاتی رہائش گاہ اور ملحقہ دفتر کو بیت رہبری کا نام دیا ہے یہاں کی سیکورٹی پر ۵۰۰ سے زیادہ افراد مامور ہیں۔

موقر ذرائع کے مطابق آیت اللہ علی خامنہ ای خورونوش میں نہایت نفیس ذوق رکھتے ہیں انہیں ٹراوٹ مچھلی مرغوب ہے اور وہ کیویار (مچھلی کے انڈوں سے تیار ہونے والی ایک قیمتی سوغات) کے شیدائی ہیں۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کو گھوڑسواری کا شوق ہے اور ان کے ذاتی اصطبل میں موجود قیمتی گھوڑوں کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔ چند برس قبل گھوڑسواری کے دوران پیش آنے والے ایک حادثے کے بعد ان کے اس شوق میں کچھ رکاوٹ ضرور آگئی ہے لیکن ان کے قیمتی گھوڑوں کا ذخیرہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح آیت اللہ علی خامنہ ای کو تمباکو کے منقش اور جڑاؤ پائپ جمع کرنے کا شوق ہے۔ اگرچہ اطلاعات کے مطابق انہوں نے کچھ برس سے تمباکو نوشی ترک کر رکھی ہے تاہم قیمتی پائپوں کا ذخیرہ بدستور موجود ہے۔

معالجین کے مطابق آیت اللہ علی خامنہ ای ڈپریشن کے پرانے مریض ہیں۔ اس مرض میں شدت کے دوران ایک خاص ملا کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو فحش لطیفے سنانے میں مہارت رکھتا ہے۔ اس ملا کی صحبت میں آیت اللہ علی خامنہ ای کو ذہنی دباؤ پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ تاہم ذرائع نے اس افواہ کی سختی سے تردید کی ہے کہ آیت اللہ علی خامنہ ای افیون یا کوئی اور نشہ آور دوا استعمال کرتے ہیں۔

ایران کی انقلابی حکومت میں اہم مناصب پر کام کرنے والے سابق اہلکاروں کے مطابق آیت اللہ علی خامنہ ای کے چاروں بیٹوں سمیت ان کے اہل خانہ نے یورپ، افریقہ اور

دوسری بین الاقوامی منڈیوں میں معاشی مفادات کا جال بچھا رکھا ہے۔اس کے باوجود سادہ زندگی کی شہرت رکھنے والے آیت اللہ علی خامنہ ای کی ذاتی دلچسپیوں کی فہرست حیران کن ہے۔آیت اللہ علی خامنہ ای کو قیمتی اور نادر چھڑیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔ ۲۰۱۳ میں جواہرات میں جڑی ایسی قیمتی چھڑیوں کی تعداد ۱۷۰ بتائی جاتی تھی جو آیت اللہ علی خامنہ ای کے ذخیرے میں شامل تھیں۔آیت اللہ علی خامنہ ای کے لئے کندھوں پر اوڑھنے والی قیمتی شال ایک خاص نسل کے اونٹوں کے بالوں سے تیار کی جاتی ہے جنہیں اسی مخصوص مقصد کے لئے پالا جاتا ہے۔

تہران میں آیت اللہ علی خامنہ ای کی رہائش گاہوں کی تعداد چھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جن میں سابق شاہ ایران کے نیاوران اور وکیل آباد والے محلات بھی شامل ہیں۔ان دونوں محلات میں ایٹمی حملے سے بچاؤ کے لئے کنکریٹ کی گہری اور مضبوط ترین پناہ گاہیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ آیت اللہ علی خامنہ ای کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ایک مکمل ذاتی ہسپتال تعمیر کیا گیا ہے جو ایک سابق وزیر صحت کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔

آیت اللہ علی خامنہ ای خفیہ اطلاعات کے نظام میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ذرائع کے مطابق آیت اللہ علی خامنہ ای کے دوسرے صاحبزادے مجتبیٰ خامنہ ای مختلف عقوبت خانوں میں حکومت مخالفین پر تشدد کی ذاتی نگرانی کرتے ہیں۔آیت اللہ علی خامنہ ای کی ہر شام کی مصروفیات میں بیس منٹ کا ایک خاص وقفہ شامل ہے جب وہ دن بھر میں خفیہ اداروں کی طرف سے مختلف سیاسی اور ریاستی عہدے داروں کی گفتگو کا ریکارڈ سنتے ہیں۔آیت اللہ علی خامنہ ای کو پر تعیش گاڑیوں کا شوق ہے اور انہیں عام طور پر بی ایم ڈبلیو میں سوار دیکھا جاتا ہے۔

❁❁❁

دانشمند و ریاضی دان ایرانی مسلمان
ابوریحان محمد بن احمد بیرونی

البیرونی ایرانی مسلمان تھا۔اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں لیکن اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اسے بچپن سے ہی حصول علم کا بہت شوق تھا۔مطالعے سے اس کی رغبت وانہماک تمام عمر جاری رہی۔کہا جاتا ہے کہ جس وقت اس کا دم نکل رہا تھا اس وقت اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا۔البیرونی نے اس وقت بھی اس سے علم الہند کے کسی مسئلے کے حل کے بارے میں دریافت کیا۔دوست کو یہ بات سن کر عجیب سا لگا لیکن البیرونی نے اس سے کہا کہ کیا اس کا ایسی حالت میں مرنا اچھا نہ ہوگا کہ وہ اس مسئلے کی حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہو۔۔۔یہ سن کر اس کے دوست نے وہ مسئلہ بیان کر دیا۔وہ دوست جونہی کمرے سے باہر آیا البیرونی نے دم توڑ دیا اور کمرے سے لوگوں کی آہ وزاری کا شور بلند ہوا۔۔۔خلیل جبران نے کہیں لکھا تھا کہ ”ہزاروں سال قبل مر چکے ستاروں کی روشنی اب بھی ہم تک پہنچتی ہے۔یہی معاملہ عظیم لوگوں کا ہے جو صدیوں پہلے مر چکے لیکن ان کی شخصیت کی شعاعیں اب بھی ہم تک پہنچتی ہیں۔۔۔زندگی کے تمام اسرار دریافت کر لینے کے بعد آپ موت کی خواہش کرتے ہیں کیونکہ یہ زندگی کا ایک اور راز ہے“

-البیرونی کا علم وفضل، علم ہیئت، تدبر اور حکمت اپنے آپ میں یکتا اور تازہ دم سہی مگر البیرونی کی علم سے لگن اور رغبت نے اسے آج بھی زندہ و نوجوان بنا رکھا ہے۔علم سے محبت کرنے والے اور علم کیلئے اپنی زندگی کو وقف کرنے والے ہمارے خیالوں میں آج بھی ایک نوجوان کی حیثیت سے اپنا مقام برقرار رکھتے ہیں۔۔۔وہ ہمارے خیالوں میں بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتے۔ان کے ہمیشہ زندہ رہنے اور ہمارے خیالوں میں ان کے بوڑھا نہ ہونے کی بڑی وجہ ہم تک پہنچنے والی ان کی علم کی شعاعیں ہی تو ہیں۔

❁❁❁

جابر ابن حیان کے بارے جانئے

تحریر: پروفیسر یعقوب خان

مشہور مسلمان سائنسدان

جابر بن حیان کا پورا نام ابو موسی جابر ابن حیان ہے مغرب میں البتہ وہ Gaber کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ایران کے شہر خراسان میں ۷۲۱ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ وہ دور بنو امیہ کا دور تھا۔ لیکن جابر کے والد بنو عباس کے حامی ہونے کی وجہ سے امویوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور کمسن جابر کو اسکی والدہ اپنے ننھیالی وطن یمن لیکر گئی جہاں اسکی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ بنو عباس کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ لوگ پھر خراسان واپس آ گئے۔ وہ کئی اساتذہ کے علاوہ امام جعفر صادقؒ کے بھی شاگرد تھے جنہوں نے جابر کو مذہبی علوم کے علاوہ علم کیمیا کی ابتدائی تعلیم بھی دی۔ حصول علم کیلئے وہ کوفہ چلے گئے جہاں انہوں نے ستاروں کی گلی نامی کوچے میں رہائش اختیار کی اور سائنسی تجربات میں مشغول ہو گئے یہیں پر آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ دنیا میں علم کیمیا یعنی chemistry کے حوالے سے بابائے کیمیا کہلائے جاتے ہیں۔ کیمسٹری کے متعلق کوئی بھی تحریر یا تخلیق جابر کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کا پایہ تخت بغداد میں تھا۔ انہوں نے جابر کو بغداد بلایا لیکن وہاں حالات اپنے موافق نہ پا کر واپس کوفہ چلے آئے۔ جابر بن حیان کے نام پر ۶۰۰ کے قریب تحریریں مشہور ہوئیں جن میں ۲۱۵ آج بھی موجود ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور انکی چار کتابیں ہیں جن کے نام ہیں

۱. کتاب علمائے اثنا عشر۔ اس کتاب میں فن کیمیاء پر بحث کی گئی ہے

۲. کتاب السبعین۔ یہ کتاب کیمسٹری کے موضوعات سے بھری پڑی ہے

۳. کتاب علماء والاربعتہ والاربعون۔ یہ کتاب علم کیمیا کی فلسفیانہ اساس پر مبنی ہے۔ اسکا دوسرا نام کتاب الموازین ہے۔

۴. کتاب الخمس

جابر دنیا کا پہلا ماہر کیمیاء ہے جس نے بھاپ کو قطرے کی شکل میں تبدیل کرنا اور عمل تزویب یعنی کسی چیز کو پگھلانے کا عمل اور عمل تحویل یعنی ایک شئے کو دوسری شئے میں تبدیل کرنے کے عملیات کا استعمال کیا ہے۔

علم کیمیاء کے علاوہ جابر بن حیان فلسفہ، ریاضی، فلکیات اور نجوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ موجودہ استعمال ہونے والے ہندسوں کے رسم الخط جابر نے ہی ایجاد کئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چاند پر گڑھوں کا علم سب سے پہلے جابر کو ہی ہوا۔ اسی لئے عربی میں اس دریافت کو حفرہ جابر کہا جاتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے کہنے پر جابر نے دو کتابیں ''الزہرا'' یعنی book of venus on art of Alchemy اور ''کتاب الکیمیاء'' تحریر کیں۔

آیئے اب جابر بن حیان کی ایجادات اور دریافتوں پر ایک نظر ڈالیں۔

۱ جدید کیمسٹری میں جو عمل اکثر بروئے کار لائے جاتے ہیں اور جو ہم تک بیسویں صدی میں پہنچے ان کی ایجاد جابر بن حیان کی مرہون منت ہے۔ یہ عمل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عمل تصعید یعنی sublimation
۲۔ عمل ترقیق (پگھلاہٹ) یا liquefaction
۳۔ عمل تلقین یعنی crystallization
۴۔ علم تقرید (عرق کشی) یعنی distillation
۵۔ عمل تطہیر یعنی purification
۶۔ عمل اختلاط یعنی amalgamation
۷۔ عمل تاکید یعنی oxidation
۸۔ عمل تسکید یعنی evaporation
۹۔ عمل تقطیر (فلٹر کرنا) یعنی filtration.

۲. ایک ایسا آلہ میزان (ترازو) جو ایک کلو گرام کے ۶۴۸۰ ویں حصے کو تول سکتا تھا۔

۳. وہ کئی دھاتوں کو تیار کرنے کا موجد ہے۔

۴. فولاد steel کو ڈھالنے کا عمل سب سے پہلے جابر نے اپنایا

۵. کیمسٹری کے تجربات میں کام آنے والے کئی آلات جیسے انبیق alembic جابر نے ایجاد کئے

۶. کپڑے اور چمڑے کی رنگائی کا کام سب سے پہلے جابر نے کیا

۷. کپڑوں کو واٹر پروف بنانے کا عمل جابر کا مرہون منت ہے

۸. شیشے کی بناوٹ کے لئے manganese oxide کا استعمال جابر نے سکھایا۔

۹. لوہے کو زنگ سے بچانے کا عمل جابر کی ایجاد ہے۔

۱۰. رنگوں اور greese کی نشاندہی جابر کی دریافت ہے۔

۱۱. سونے کو پگھلانے کیلئے کام میں آنے والا مرکب aqua rigia جابر بن حیان کی ایجاد ہے۔

۱۱. جابر نے مادے کی classification کیلئے اسکو تین طبقوں میں تقسیم کیا:

اول۔ spirits جو گرم کرنے سے بخارات میں تبدیل ہوجاتے ہیں

دوئم۔ دھات جیسے سونا، چاندی، سیماب، لوہا، تانبا، اور

سوئم۔ حجرات یعنی پتھر جو گھسنے پر ریزہ ہوجاتے ہیں۔

یہی بنیادی عمل جدید کیمسٹری میں مادوں کی classification میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ جدید علم۔ کیمیاء یعنی chemistry کی بنیاد جابر بن حیان کی مرہون منت ہے۔

جابر کی وفات بھی عجیب حالت میں ہوئی۔ دراصل خلیفہ hوقت سے کسی بات پر اختلاف ہونے کے نتیجے میں جابر بن حیات کو گھر میں نظر بند کیا گیا جہاں ۸۱۵ عیسوی میں انکی وفات ہوگئی۔

❁❁❁

پانچ نوبیل انعام یافتہ سائنسدانوں نے بچوں کے لیے مضامین پیش کر دیئے

شکاگو: افریقہ سے امریکہ تک ہر بچے کے اندر کچھ جاننے کا تجسس موجود ہوتا ہے جس میں سائنسی معلومات بھی شامل ہیں۔ اب پانچ نوبیل انعام یافتہ سائنسدانوں نے بچوں کے لیے اپنی خاص تحریریں پیش کی ہیں جو فرنٹیئر نامی ویب سائٹ پر ’مجموعہ نوبیل‘ کے نام سے پیش کی گئی ہیں۔

اس مجموعے میں نوبیل انعام یافتہ ماہرین نے گزشتہ ۲۰ برس میں ہونے والی سائنس کی بہترین دریافتوں کا احوال پیش کیا ہے۔ ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے ۸ تا ۱۵ سال تک کے بچوں کے لیے یہ تحریریں قلمبند کی گئی ہیں۔ ویب سائٹ پر شائع ہونے کے بعد بچوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اسے پڑھیں اور اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔

بچوں کی بڑی تعداد اسے قابلِ فہم، پرمزاح اور گرفت میں لینے والے مضامین کہا ہے۔ سوئزرلینڈ سے ایک ۱۳ سالہ بچے نے کہا کہ میں سائنس میں بہت دلچسپی رکھتا ہوں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ماہرین نے اپنے شعبوں پر تحریریں لکھی ہیں۔ یہ معلومات بہت ضرری ہیں۔

۲۰۱۴ میں طب وفعلیات کے شعبے میں نوبیل انعام حاصل کرنے والے پروفیسر مے برٹ موزر نے کہا کہ وہ بچوں کے لیے لکھتے ہوئے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ بچے مجھ سے سوال کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس طرح ان کے دماغوں کی پرورش ہوتی ہے اور سائنس سے لگاؤ پروان چڑھتا ہے۔

ویب سائٹ پر شائع مضامین کے نام یہ ہیں: دماغ میں گرڈ خلیات کی موجودگی جسے پروفیسر مے برٹ موزر نے لکھا ہے جنہیں ۲۰۱۴ میں طب کا نوبیل انعام دیا گیا تھا۔ دوسری تحریر حیاتیات میں کمپیوٹر تقول پر ہے جسے پروفیسر مائیکل لیوٹ نے لکھا ہے۔ انہیں ۲۰۱۳ میں کیمیا کا نوبیل انعام دیا گیا تھا۔

تیسری اہم تحریر ۲۰۱۱ میں کیمیا کا نوبیل حاصل کرنے والے پروفیسر ڈین شیشتماں نے لکھی ہے جو کوازی کرسٹل پر ہے۔ ٹرانسکرپشن آف لائف فرایم ڈی این اے ٹو آر این اے پروفیسر روجر ڈ ڈی کورنبرگ کی تحریر ہے جنہیں ۲۰۰۶ میں کیمیا کا نوبیل انعام عطا کیا گیا تھا۔ آخری مضمون ۲۰۰۴ میں کیمیا کے نوبیل انعام یافتہ ماہر آرون سیکانوور نے تحریر کیا ہے جو پروٹین کے بارے میں ہے۔

واضح رہے کہ فرنٹیرز فار ینگ مائنڈ جرنل اور ویب سائٹ دونوں ہی غیر منافع بخش اقدامات ہیں جن کی بدولت دنیا بھر کے بچوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر اعلیٰ اور درست ترین معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ اب تک ایک کروڑ سے زائد بچے اس ویب سائٹ کو دیکھ چکے ہیں۔

❁❁❁

دو دلچسپ واقعات

تحریر: ڈاکٹر عبدالقدیر خان

سیاست اور کرکٹ اور عوام کی کسمپرسی نے آجکل تمام ذرائع ابلاغ کو یرغمال بنالیا ہے۔ آیئے کچھ دوسرے دلچسپ واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کم ازکم ان سے آپ کی معلومات میں اضافہ تو ہوگا۔

(۱) پہلا نہایت دلچسپ واقعہ حجر اسود کا ہے۔ آپ کو علم ہے نا کہ یہ سیاہ پتھر چاندی کے ایک فریم میں خانہ کعبہ میں نصب ہے۔ طواف (عمرہ یا حج) کے دوران ہم اس کو بوسہ دیتے ہیں۔ یہ روایت بہت پرانی ہے اور ہمارے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بوسہ دیا تھا اور جب حضرت عمرؓ طواف کر رہے تھے تو آپ نے حجر اسود کو بوسہ دینے سے پہلے فرمایا تھا کہ انھیں علم ہے کہ وہ صرف ایک پتھر ہے اور کچھ نہیں مگر چونکہ رسولؐ نے بوسہ دیا تھا صرف اس وجہ سے وہ بھی اس کو بوسہ دے رہے ہیں۔

حجر اسود کی واپسی۔ ایک تاریخی واقعہ۔

ذی الحجہ ۳۱۷ ھ کو بحرین کے حاکم ابوطاہر سلیمان قرامطی نے مکہ معظّمہ پر قبضہ کرلیا۔ خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ اس سال حج بیت اللہ نہ ہوسکا، کوئی بھی شخص عرفات نہ جاسکا۔ یہ اسلام میں پہلا ایسا موقع تھا کہ حج بیت اللہ موقوف ہوگیا، اسی ابوطاہر قرامطی نے حجر اسود کو بیت اللہ سے نکالا اور اپنے ساتھ بحرین لے گیا۔ پھر بنو عباس کے خلیفہ مقتدر باللہ نے ابوطاہر کے ساتھ معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تیس ہزار دینار دیئے اور حجر اسود خانہ کعبہ کو واپس کیا گیا۔ یہ واپسی ۳۳۹ ھ کو ہوئی، گویا بائیس سال تک خانہ کعبہ حجر اسود سے خالی رہا۔ جب فیصلہ ہوا کہ حجر اسود کو واپس کیا جائے گا تو اس سلسلے میں خلیفہ وقت نے ایک بڑے عالم محدث عبداللہ کو حجر اسود کی وصولی کے لئے ایک وفد کے ساتھ بحرین بھجوایا۔ یہ واقعہ علامہ سیوطی کی روایت سے اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ جب شیخ عبداللہ بحرین پہنچے تو بحرین کے حاکم نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جہاں حجر اسود کو اُن کے حوالہ کیا جائے گا۔ اب انہوں نے ایک پتھر جو خوشبو دار تھا، خوبصورت غلاف سے نکالا کہ یہ حجر اسود ہے اسے لے جائیں۔ محدث عبداللہ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ حجر اسود میں دو نشانیاں ہیں اگر اس میں یہ نشانیاں پائی جائیں تو یہ حجر اسود ہوگا ورنہ نہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ڈوبتا نہیں ہے، دوسری یہ کہ آگ سے بھی گرم نہیں ہوتا۔ اس پتھر کو جب پانی میں ڈالا گیا تو ڈوب گیا پھر آگ میں اسے ڈالا گیا تو سخت گرم ہوگیا یہاں تک کہ پھٹ گیا۔ محدث عبداللہ نے فرمایا یہ ہمارا حجر اسود نہیں۔ پھر دوسرا پتھر لایا گیا اس کے ساتھ بھی یہی عمل ہوا اور وہ پانی میں ڈوب گیا اور آگ پر گرم ہوگیا، فرمایا کہ ہم اصل حجر اسود ہی لیں گے۔ پھر اصل حجر اسود لایا گیا اور آگ میں ڈالا گیا تو ٹھنڈا نکلا پھر پانی میں ڈالا گیا تو وہ پھول کی طرح پانی کے اوپر تیرنے لگا تو محدث عبداللہ نے فرمایا، ”یہی ہمارا حجر اسود ہے اور یہی خانہ کعبہ کی زینت ہے اور یہی جنت والا پتھر ہے“۔ اس وقت ابوطاہر قرامطی نے تعجب کیا اور پوچھا کہ یہ باتیں آپ کو کہاں سے ملی ہیں؟ تو محدث عبداللہ نے فرمایا: یہ باتیں ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہیں کہ حجر اسود پانی میں ڈوبے گا نہیں اور آگ سے گرم نہیں ہوگا۔ ابوطاہر نے کہا کہ یہ دین روایات سے بڑا مضبوط ہے۔ جب حجر اسود مسلمانوں کو مل گیا تو اسے ایک کمزور اونٹنی کے اوپر لادا گیا جس نے تیز رفتاری کے ساتھ اسے خانہ کعبہ پہنچایا، اس اونٹنی میں زبردست قوّت آگئی اس لئے کہ حجر اسود اپنے مرکز (بیت اللہ) کی طرف جارہا تھا لیکن جب اسے خانہ کعبہ سے نکالا گیا تھا اور بحرین لے جارہے تھے تو جس اونٹ پر لادا جاتا وہ مرجاتا حتیٰ کہ بحرین پہنچنے تک چالیس اونٹ اس کے نیچے مرگئے۔“ (تاریخ مکہ للطبری) (بشکریہ: مولانا یاسر حبیب صاحب)

(۲) دوسرا نہایت دلچسپ واہم واقعہ مشہور امریکن ٹینس کھلاڑی آرتھر ایش (Arthur Ashe) کا ہے۔ یہ افریقن، امریکی نژاد تھے۔ ان کو آپریشن کے دوران جو خون دیا گیا وہ کسی ایڈز (Aids) کے مریض کا تھا اور اس طرح آرتھر ایش اس ناقابل علاج بیماری کا شکار ہوگئے اور ۶ جنوری ۱۹۹۳ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ ۱۰ جولائی ۱۹۴۳ کو پیدا ہوئے تھے۔ آرتھر ایش پہلے افریقن، امریکی تھے جنھوں نے ڈیوس کپ میں امریکہ کی نمائندگی کی تھی اور وہ پہلے سیاہ فام تھے جنھوں نے یو ایس اوپن اور وِمبلڈن کپ (۱۹۷۵) جیتے تھے اور وہ پہلے سیاہ فام امریکی تھے جو دنیا میں پہلے نمبر کے کھلاڑی بنے تھے۔ آرتھر ایش جب اسپتال میں بیمار تھے اور ان کو ایڈز کی بیماری کی تشخیص ہوگئی تو پورے ملک میں ان کے لئے ہمدردی کے جذبات اُبل پڑے تھے اور لوگ ہر موقع اور ہر جگہ اس کا اظہار کر رہے تھے ان کو ہزاروں خطوط بھیجے گئے اور ہمدردی اور دعاؤں کا اظہار کیا گیا۔ ایک خط میں ان سے ایک سوال کیا گیا۔ ”اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہی کیوں اس موذی بیماری کے لئے چنا؟“۔ اس کا جواب جو آرتھر ایش نے دیا وہ نہایت قابل غور ہے۔ ”میری وجہ سے ۵۰ ملین (۵ کروڑ) بچوں نے ٹینس کھیلنا شروع کردیا۔ ۵ ملین نے ٹینس کھیلنا اچھی طرح سیکھ لیا۔ ۵ لاکھ نے پیشہ ورانہ ٹینس کھیلنا شروع کردیا۔ ۵۰ ہزار ٹورنامنٹس میں حصّہ لینے لگے۔ ۵ ہزار بڑے مقابلوں میں حصّہ لے سکے۔ ۵۰ نے اتنی مہارت حاصل کی کہ وہ ومبلڈن میں حصّہ لے سکے۔ ۴ سیمی فائنل تک پہنچ گئے۔ ۲ نے فائنل تک رسائی حاصل کی۔ جب میں

نے ومبلڈن ٹورنامنٹ جیتا اور کپ لیے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا اس وقت میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال نہیں کیا کہ اس نے مجھے کیوں اس اعزاز سے نوازا؟ اور اب جبکہ بیمار ہوں اور تکلیف میں ہوں میں کس منہ سے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کروں کہ اس نے کیوں مجھے یہ مہلک بیماری دی؟ یاد رکھیں کہ خوشی آپ کو خوش مزاج رکھتی ہے۔ مشکلات و تکالیف آپ کو مضبوط بناتی ہیں۔ غم و رنج آپ کو انسانیت سکھاتے ہیں۔ شکست آپ کو انکساری سکھاتی ہے۔ کامیابی آپ کو خود اعتمادی دیتی ہے لیکن صرف ایمان ہی آپ کو تمام حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ بعض اوقات آپ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتے مگر لاتعداد آپ کی زندگی کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنانا چاہتے ہیں۔ ایک بچہ دیہات میں کھڑا اُڑتا جہاز دیکھتا ہے تو اس کی خواہش اُڑنے کی ہوتی ہے مگر جب ایک پائلٹ اپنے جہاز سے نیچے مکانات، باغات دیکھتا ہے تو اسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ آپ کوشش کریں کہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ اگر دولت انسان کو خوش کرسکتی تو مالدار لوگ سڑکوں پر چلتے پھرتے ناچ رہے ہوتے۔ لیکن آپ کو علم ہے کہ یہ مزا صرف غریب بچے ہی اُڑاتے ہیں۔ اگر قوت و دولت حفاظت دیتی تو تمام اہم اور بااختیار لوگ بغیر محافظوں کے کھلے عام پھرتے نظر آتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام سیدھے سادھے انسان، بہت پرسکون اور گہری نیند سوتے ہیں۔ اسی طرح اگر خوبصورتی اور شہرت مثالی رشتہ قائم کرسکتے تو تمام شہرت یافتہ اور مشہور لوگوں کی مثالی شادیاں ہوتیں (جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے)۔"

یہ دو نہایت دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر واقعات آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں اُمید ہے کہ آپ ان معلومات سے بہت کچھ سیکھ گئے ہونگے۔

❁❁❁

ہماری زندگیوں کو چیزوں کی کثرت کھا گئی ہے

کسی دور میں دس یا بارہ گانوں والا ایک کیسٹ ہوتا تھا۔ کوئی بہت شوقین ہوتا تو اپنی پسند کی لسٹ دے کر گانے بھرواتا۔ سب گانے، بہت مزے سے سنتے تھے اب ہزاروں گانے ہوتے ہیں USB میں اور کوئی پسند نہیں آتا۔

دو تین دوست ہوتے تھے جن سے ہر خوشی غم سانجھا ہوتا تھا۔ جب ضرورت ہو آ موجود ہوتے۔ اب سوشل میڈیا پر ہزاروں اور کانٹیکٹ لسٹ میں سینکڑوں لوگ ہیں مگر بے کار۔

یاد پڑتا ہے کہ گھروں میں بمشکل ایک سائیکل ہوتی تھی اسی پر گھر کی ساری شاپنگ بھی ہوتی تھی، سکول ٹیوشنز اور دوستوں سے ملنا بھی۔ یہ سب کر کے بھی فراغت کا وقت بچ جاتا تھا۔ اب گاڑیاں اور بائیکس کھڑی ہوتی ہیں مگر ان پر کام ختم نہیں ہوتے، بھاگ دوڑ میں ایسے دن گزر جاتا ہے پتہ بھی نہیں چلتا۔

اور اس سے بھی مزے کی بات اس ایک سائیکل کو بھی روز پنکچر لگتا یا ٹائر میں سپرنگ والے ہینڈ پمپ سے ہوا بھرنی پڑتی تھی۔ کبھی اس کے کُتے فیل ہوجاتے، تو کبھی ہینڈل ››ونگا‹‹ (ٹیڑھا) ہوجاتا، کبھی چین اتر جاتی تو کبھی بریک فیل۔ ان سب مشکلات کے باوجود کبھی کام نپٹانے میں مشکل نہیں پڑتی تھی۔

پورے ہفتے میں سنڈے کو پکچر لگتی تھی اور بدھ کو چترہار۔ اسی کے چکر میں اینٹینے ہلا ہلا کر باولے ہوئے رہتے تھے۔ سارے گھر میں ایک ٹی وی ہوتا وہ بھی ناب یا بٹنوں والا، اور سارے دن میں صرف ایک ڈرامہ لگتا تھا رات آٹھ بجے۔ سب مل کر دیکھتے۔ اب کیبل پر سینکڑوں چینل ہزاروں ڈرامے مگر کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔

پیسے جمع کر کے لائبریری سے کرائے پہ رسالے لائے جاتے اور ایک ہی دن میں پورا ختم کر دیتے۔ گھر میں بچوں بڑوں ہر کسی کی بیڈ سائیڈ پر ناول، رسالہ یا کوئی کتاب ضرور ہوتی جو وہ رات کو پڑھ کر سوتے۔

پیسے ڈال کر وی سی آر منگوایا جاتا، فلموں کی لسٹ بنتی اور گروپ کی شکل میں بیٹھ کر فلمیں دیکھی جاتیں۔ اب تو موبائل پر جب چاہیں فلم دیکھ لیں مگر وہ مزہ اور طلب ختم ہوگئی۔

مجھے یاد پڑھتا ہے گرمیوں میں سرشام صحن میں چھڑکاو کر کے چارپائیاں ڈل جاتیں۔ سونے سے پہلے سارے دن کی رپورٹیں ایکسچینج ہوتیں۔ ایک پیڈسٹل فین ہوتا تھا اور لائن میں پانچ سے چھ چارپائیاں ہوتی تھیں۔ دور کی چارپائی تک ہوا مشکل سے ہی پہنچتی۔ اب ہر کمرے میں اے سی ہے مگر نیند غائب۔

وقت کیساتھ ضرورتیں بھی بدل گئیں اور خلوص بھی۔ *جب چیزیں تھوڑی تھیں تب قدر تھی اب ہر چیز کی بہتات ہے پر ناقدری۔ *بس ہماری زندگیوں کو چیزوں کی کثرت کھاگئی۔

❁❁❁

انڈیا میں یہودیوں کی تاریخ

تحریر: اومکار کرمبیلکر

جب ایک یہودی شخص انڈیا کی مسلم ریاست کا وزیر اعظم بنا

انڈیا کی مغربی ریاست مہاراشٹر کے شہر علی باغ میں آج اگر آپ سیاحوں سے بھری کسی جگہ سے آگے بڑھ کر لوگوں سے پوچھیں گے کہ سینا گاگ (یہودی عبادت گاہ) کہاں ہے تو شاید آپ کو اس سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

وہاں کے لوگ 'ماگن اوبوتھ' جیسے مشہور سینا گاگ کے بارے میں نہیں جانتے! یہ سوال آپ کے ذہن میں آسکتا ہے۔ یہ سوال میرے ذہن میں بھی آیا لیکن پھر ایک مقامی خاتون نے مجھ سے کہا 'آپ سینا گاگ نہیں مشید (مسجد) کہیے۔' جب میں نے مسجد کے بارے میں پوچھا تو لوگ سمجھ گئے۔

»اچھا، آپ کو مسجد جانا ہے؟' یہ کہتے ہوئے کوئی بھی آپ کو سینا گاگ تک پہنچا دے گا اور پھر آپ کے ذہن میں یہ سوال آئے گا کہ کسی سینا گاگ کو مسجد کیسے کہا جا سکتا ہے؟

لیکن اس کے بعد آپ کو اس طرح کے اور بھی جھٹکے لگیں گے اور آہستہ آہستہ آپ کو 'بنی اسرائیل' کے بارے میں پتا چل جائے گا۔ آج متحدہ عرب امارات، بحرین اور اسرائیل کے مابین ہونے والے امن مذاکرات سے سب حیران ہیں۔ یہاں تک کہ یروشلم، واشنگٹن اور دبئی میں بیٹھے رہنماؤں کو بھی شاید اس پر یقین نہیں آرہا ہو گا اور کئی لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ متحدہ عرب امارات جیسا مسلمان ملک اسرائیل کو غیر مشروط تسلیم کیسے کر سکتا ہے؟

انڈیا میں ماضی کی شراکت پوشیدہ ہے

انڈین مسلمان اور یہودیوں نے (خاص طور پر مراٹھی بنی اسرائیلی) کئی صدیوں پہلے ایک ساتھ رہنے کی مثال قائم کی تھی۔ سنہ ۱۹۴۸ میں اسرائیل کے قیام کے بعد سے شاید ہی کوئی ایک سال پر امن رہا ہو۔ لیکن مہاراشٹر میں نہ صرف مسلمان اور یہودی بلکہ ہندو، پارسی اور عیسائی تمام مذاہب کے لوگ خوشی خوشی ایک ساتھ رہتے ہیں صرف یہی نہیں مہاراشٹر کی تاریخ میں ایک مسلمان ریاست کی حکمرانی ایک یہودی شخص نے سنبھالی تھی۔

جب رومن سلطنت نے بیت المقدس کے یہودی سینا گاگ (عبادت گاہ) کو توڑا تو یہودیوں نے یہودیہ (اب اسرائیل) اور شمالی گالیلی صوبہ چھوڑ دیا۔ سنہ ۱۳۵ عیسوی یعنی آج سے ۱۸۸۵ سال قبل جب رومیوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کیا تو یہودی اپنے مذہب اور ثقافت کو بچانے کے لیے رومن سلطنت سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔

یہودی گروہ در گروہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں آباد ہو گئے۔ ان گروہوں کو 'لاپتہ قبائل' کہا جاتا ہے اور انڈیا میں آنے والے بنی اسرائیلی، کوچین میں آنے والے یہودی اور منی پور میں آباد بنی مناشے اس برادری سے تعلق رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح سے بنی اسرائیل اور انڈیا کا رشتہ ۱۸۰۰ سال سے زیادہ پرانا ہے۔

مورو ڈ جنجیرہ ریاست

اب مسلمانوں کی اس شاہی ریاست کی بات جس نے یہودی کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔

مورو ڈ- جنجیرہ ریاست مہاراشٹر کے مغربی کنارے پر تھی۔ یہاں سدی برادری کا راج تھا عربی زبان کا لفظ جزیرہ مقامی زبان میں بدل کر جنجیرہ ہو گیا۔ یہ ریاست ایک جزیرے پر آباد تھی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر تھا۔ دادی رستم جی بانا جی کی کتاب 'بامبے اینڈ دی سدیز' میں اس کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

یہودیوں کی طرح سدی برادری بھی باہر سے انڈیا آکر آباد ہو گئی تھی۔ ساتویں صدی میں افریقہ سے آئے سدی پہلے غلام اور پھر بہادر سپاہی کی حیثیت سے انڈیا کے کئی حصے میں پھیل گئے۔ ان میں سے ایک ملک عنبر احمد نگر ریاست میں وزیر اعظم بھی بنے۔

جماعت الدین یعقوت نامی سدی غلام دلی کی ملکہ رضیہ سلطان کے لیے خاص کہے جاتے ہیں۔ جنجیرہ اور جعفر آباد سدی سلطنت تھی اور اس کے بعد گجرات کی سچن سلطنت سدیوں نے حاصل کر لی۔ ان کی جنگ کرنے کی صلاحیت قد کاٹھی کو دیکھ کر بہت سے بادشاہوں نے انھیں پناہ دی اور انھیں اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ سدی آج بھی مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک، مدھیہ پردیش، تیلنگانہ وغیرہ ریاستوں میں موجود ہیں۔ سدی پاکستان کے صوبہ بلوچستان اور سندھ میں بھی رہتے ہیں۔ سدی کے زیر تسلط جنجیرہ قلعہ کو کوئی مراٹھی بادشاہ یا پیشوا نہیں جیت سکا تھا۔ سنہ ۱۹۴۸ میں انڈیا میں شامل ہونے کے بعد بھی یہ جنجیرہ قلعہ مراٹھی صوبے کے دائرہ کار میں نہیں آیا۔ گووند سکھارام سردیسائی کی تصنیف 'مراٹھا ریاست جلد ۳' سے ستارا کے ساہو مہاراج، پیشوا اور سدی برادری کی باہمی جدوجہد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مورو ڈ جنجیرہ ریاست کے لیے تاریخی دستاویزات اور پرانی کتابوں میں 'حبسان' لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'حبسان' لفظ حبشہ (آج کے ایتھوپیا) سے آیا تھا۔

اس وقت سدی برادری کو مہاراشٹر میں 'حبشی' کہا جاتا تھا۔ اس سلطنت کے دیوان کا عہدہ شلوم باپو جی ور گھر کر کے پاس تھا۔ دیوان کے عہدے کو 'ریاست کا کار پرداز' بھی کہا جاتا تھا۔

شلوم باپو جی اسرائیل ور گھر کر

شلوم باپو جی اسرائیل ور گھر کر ۷ اگست ۱۸۵۳ کو بیلگام میں پیدا ہوئے تھے۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھیں کلرک کی نوکری مل گئی اور بعد میں وہ ہیڈ کلرک بن گئے۔ انھوں نے سنہ ۱۸۷۲ سے کام شروع کیا اور ۱۸۸۸ میں نواب جنجیرہ نے انھیں 'خان صاحب' کے خطاب سے نوازا۔ اس کے فوراً بعد ہی انھیں 'خان بہادر' کا خطاب بھی ملا۔ صرف یہی نہیں وہ سنہ ۱۸۹۱-۹۶ تک جنجیرہ سلطنت کے دیوان بھی رہے یعنی اس دوران انھوں نے شاہی ریاست کے کام سنبھالے۔ اس وقت احمد خان سدی ابراہیم خان جنجیرہ کے نواب تھے۔ تل ابیب (اسرائیل) میں رہنے والے تاریخ دان الیاز دانڈ یکر نے بی بی سی مراٹھی سے اس بارے میں بات کی۔ انھوں نے بتایا کہ 'مورو ڈ جنجیرہ ریاست میں مسلمان اور ہندو دونوں برادریوں کے لوگ آباد تھے۔ شلوم نے دونوں مذہبی برادریوں کے مابین اتحاد قائم کرنے کے لیے کام کیا۔'

نواب نے قبرستان کے لیے جگہ دی

سنہ ۱۸۹۴ میں شلوم باپو جی کی بیٹی ملکہ کا مورو ڈ میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی بیٹی کے لیے یہودی قبرستان میں جگہ نہیں تھی۔ شلوم باپو جی نے نواب کو یہ بات بتائی۔ اس کے بعد نواب نے یہودی قبرستان کے لیے زمین دی۔ یہ قبرستان ابھی بھی مورو ڈ میں موجود ہے۔ ریاست جنجیرہ کی سالانہ رپورٹ دیکھنے کے بعد ہر مذہب کے لوگوں کو 'دیوان' کے عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا۔ شلوم سے پہلے دیوان کے عہدے پر وناک سکھارام کارنک اور مرزا عباس بیگ فائز تھے۔ شلوم کے بعد راؤ بہادر وینکٹ راؤ سببا راو کو پیکار دیوان بنے۔ سن ۱۸۹۶-۹۷ میں سلطنت جنجیرہ کی سالانہ رپورٹ کے بعد سر نیائے دھیش رگھوناتھ دامودر نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ پارسی مذہب کے کرسیٹ جی جیون جی مستری کو مقرر کیا گیا یعنی ریاست جنجیرہ میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو سینیئر عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ شاہی ریاست کی کچھ سالانہ رپورٹس میں دیوان کا لفظ مینیجر کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر جنجیرہ کی سلطنت کی سالانہ رپورٹ ۱۸۹۰-۹۸ کے درمیان دستیاب ہیں مورخ الیاز دانڈ یکر جو اب اسرائیل میں آباد ہیں ان کے پردادا بھی مورو ڈ ریاست کے ملازم تھے۔ وہ مورو ڈ کے چیف واٹر انجینیئر تھے۔ دانڈ یکر وضاحت کرتے ہیں: 'میرے پردادا نے وہاں پانی کا انتظام کیا۔ ان کی منصوبہ بندی کا طریقہ اب بھی استعمال میں ہے۔ انھیں بھی اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا جس کے لیے نواب نے یہ زمین دی تھی۔' شلوم باپو جی ۱۹۴۲ میں پونا میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔

جیکب باپو جی اور ہائم شلوم

شلوم کے بھائی جیکب باپو جی آندھ ریاست کے نگران بنے۔ وہ ۱۸۶۵ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھیں بھی 'خان بہادر' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ آندھ کے راجہ بھوان راو پنت پرتینیدھی نے اپنی سوانح عمری میں جیکب کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت راجہ اور ملازم کے مابین جو رشتہ ہوتا تھا اس کا اندازہ ان سوانح عمری سے لگایا جا سکتا ہے۔

جیکب باپو جی کا انتقال ۱۹۳۳ میں ہوا۔ ریاست آندھ کی سنہ ۱۹۰۸ کی سالانہ رپورٹ میں ان کا ذکر 'جیکب بی اسرائیل' کے نام سے ہے اور ان کے نام کے ساتھ 'ذمہ دار، آندھ ریاست' لکھا گیا ہے۔ بعد میں شلوم باپو جی کے بیٹے ہائم وار گھر کر اکل کوٹ کی سلطنت کے دیوان بنے۔ ایسا لگتا ہے کہ وار گھر کر خاندان کے ہندو اور مسلم دونوں برادریوں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ جیکب باپو جی نے سنہ ۱۹۲۶ میں 'دی ازرالائٹ' میگزین میں اپنی والدہ اور نانی کے بارے میں لکھا ہے۔ اس مضمون کو نینا ہائمز اور الیا شاہائمز کی کتاب 'انڈین جیوئش وومن' میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں جیکب نے بتایا ہے کہ کس طرح ان کی ماں نے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا۔

ریاست آندھ میں کام کرتے ہوئے جیکب کی ایک مسلمان عورت سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی ماں کی یادیں اس خاتون کے ساتھ شیئر کیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا: 'اس خاتون سے اپنی ماں کے بارے میں بات کرنے کے بعد میری آنکھیں بھر گئیں۔ میرے گھر خواہ ہندو سادھو آئے یا مسلمان فقیر میری ماں دونوں کو عطیہ کرتی تھیں۔ شادی بیاہ میں مسلمان خواتین کے ساتھ مل کر ایک ساتھ گیت گایا جاتا تھا۔ جیکب نے لکھا ہے کہ ان کی نانی کو شلوم کے بیٹے ہائم کا نام رکھنے کی سعادت ملی۔

یہودی انڈیا کے لوگوں کے ساتھ کس طرح گھل مل گئے

یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہودی تقریباً ۱۸۰۰ سال پہلے انڈیا آئے تھے۔ یہ لوگ علی باغ کے قریب نوگاؤں کے ساحل پر جہاز کے خراب ہونے کے بعد ساحل پر آئے تھے۔ اس کے بعد وہ یہاں بس گئے اور انھوں نے تیل نکالنے کا اپنا پرانا کام جاری رکھا۔ ہفتے کے روز (سبت) چھٹی لینے کی وجہ سے انھیں کونکن میں 'شنوار تیلی' کہا گیا تھا۔ اس وقت، ہندو تیلی پیر کے روز چھٹی لے کر جاتے تھے تاکہ ہندو عقائد کے مطابق بھگوان شیو کی سواری سمجھے جانے والے نندی (بیل) کو اس دن کام نہیں کرنا پڑے گا۔

انڈیا میں بنی اسرائیل، بغدادی، بنی مناشے اور کوچین کے یہودی فرقے ہیں۔ بنی اسرائیلی مقامی ثقافت سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ وہ جس گاؤں میں آباد ہوئے وہیں کا نام اپنا شروع کر دیا۔ راج پورکر، تلکر، نوگاوکر، دانڈ یکر، دیویکر، روہیکر، پینکر، پیزار کر، جھڑادکر، چیولکر، اشٹمکر، آپٹیکر، آوسکر، چنچولکر، چانڈگاوکر ایسے کم و بیش ۳۵۰ اسم (کنیت) مراٹھی یہودی برادری میں شامل ہیں۔ ان لوگوں نے خود کو 'بنی اسرائیلی' یعنی 'بنی اسرائیل' کہنا شروع کیا۔

مقامی لوگوں کو ان کے بارے میں زیادہ دنوں تک زیادہ معلومات نہیں تھی۔ پھر ڈیوڈ راحب نامی ایک شخص کونکن آئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی یہاں آمد کا وقت اب سے

ڈیڑھ ہزار سال کے درمیان ہے لیکن ان کی کوئی مستند تاریخ نہیں ملتی ہے۔ ڈاکٹر ایرین جوڈا نے ایک کتاب 'ایوولیوشن آف دی بنی اسرائیل اینڈ دیئر سینا گاگ ان دی کونکن' میں ڈیوڈ راہب کے بارے میں لکھا ہے۔ ڈیوڈ راحب نے دیکھا کہ ان لوگوں کا کھانا پینا اور رہن سہن یہودیوں کی طرح ہے۔ انھوں نے شاپور کر، جھیراڈ کر اور راج پور کر خاندانوں میں سے تین افراد کا انتخاب کیا اور ان کی تربیت کی۔ ان تینوں کے لیے انھوں نے 'قاضی' کا لفظ استعمال کیا۔ کچھ عرصہ بعد یہودی برادری نے تعلیم کے بعد صحیفے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔

تعلیم اور نوکریاں

جس وقت ممبئی ترقی کر رہا تھا اس وقت مغربی انڈیا میں انگریزی تعلیم کی اہمیت کا احساس بڑھ رہا تھا اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جا رہا تھا جن برادریوں نے پہلے انگریزی زبان سیکھی تھی انھیں پہلے نوکریاں ملیں جس سے ان کی معاشی حالت بہتر ہوئی۔

پارسی، بنی اسرائیل اور گور سارسوت برہمنوں نے ۱۸ ویں صدی سے پہلے تجارت اور دیگر کاموں کے لیے ٹھیکے حاصل کیے تھے۔ بہت سے لوگوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں پولیس اور دیگر محکموں میں کام ملا۔ 'ممبئی چہ ورنن' یعنی ذکر ممبئی نام کی کتاب لکھنے والے گووند نارائن ماڈگاؤں کر کے مطابق بنی اسرائیل سنہ ۱۷۵۰ میں کونکن سے ممبئی آئے تھے۔ یہاں آ کر انھوں نے کمانڈنٹ، میجر صوبیدار، نائک اور حوالدار جیسے عہدے حاصل کیے۔ کتاب 'ممبئی چے ورنن' میں انھوں نے لکھا ہے کہ 'بنی اسرائیل انگریزی سیکھتے تھے اور ٹیچر بنتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ بنی اسرائیلی برادری میں تعلیم بہت تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ پورے انڈیا میں آباد ہونے لگے، لیکن یہودیوں کے مخصوص نئے ملک اسرائیل کے قیام کے بعد زیادہ تر لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔

'مسجد بندر' کی مسجد کہاں سے آئی؟

علی باغ کی طرح ممبئی میں بھی 'مسجد بندر' سٹیشن کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ جس مسجد سے سٹیشن کا نام آیا وہ مسلمانوں کی عبادت کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ یہودیوں کی عبادت گاہ سینا گاگ ہے۔ اور اس عبادت خانے کی تعمیر میں تھوڑا سا حصہ جنوبی ہند کے معروف سلطان ٹیپو سلطان کا تھا۔ انڈیا میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین رشتہ کچھ اسی طرح کا رہا ہے۔ ممبئی میں 'گیٹ آف مرسی' (رحمت کا دروازہ) 'شاہراہ میم' کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن مقامی لوگ اسے 'جونی مشید' (پرانی مسجد) کے نام سے جانتے ہیں۔

اس سینا گاگ کی تعمیر سموئیل آئیزیکیل دیویکر (ساماجی ہاساجی دیویکر) نے کی تھی۔ سموئیل اور اس کے بھائی انگریزی فوج کی طرف سے ٹیپو کے خلاف لڑتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ٹیپو کی عدالت میں ان دونوں کی سماعت کے بعد سزا ہوئی تھی لیکن ٹیپو کی والدہ کو لگا کہ ان کے نام مختلف ہیں اس لیے انھوں نے ٹیپو سے دونوں بھائیوں کو چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ سموئیل نے منت مانی تھی کہ اگر وہ صحیح سلامت بمبئی واپس آ جاتے ہیں تو وہ وہاں سینا گاگ بنوائیں گے اور انھوں نے اپنی یہ منت پوری کی۔ اس طرح ممبئی کے یہودیوں کو اپنا پہلا عبادت خانہ مل گیا۔ مورخ الیاز دانڈیکر نے 'مدر انڈیا، فادر اسرائیل' نامی کتاب میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ دیویکر برادران نے ٹیپو سلطان کی خفیہ معلومات انگریزوں کو دیں اور اگلی جنگ میں انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

شاید اسی وجہ سے ٹیپو کی والدہ فاطمہ فخر النسا نے دیویکر خاندان کو سات نسلوں تک غم میں مبتلا رہنے کی بددعا دی۔ دانڈیکر نے اپنی کتاب میں اس واقعے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

بنی اسرائیلی اپنی عبادت کو نماز، مدفن کو قبرستان، روزہ اور گروہ کے لیے جماعت جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اور فارسی زبان کے یہ الفاظ انڈین مسلمانوں کے توسط سے بنی اسرائیلیوں تک پہنچے۔ بنی اسرائیلی برطانوی سلطنت میں نوکریوں اور تجارت کی وجہ سے برطانوی سلطنت میں مقیم اور آباد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مراٹھی یہودیوں کی قبروں پر کتبے عبرانی اور مراٹھی (دیوناگری) دونوں رسم الخط میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ آج اگرچہ پاکستان اور اسرائیل کے سفارتی تعلقات نہیں ہیں لیکن مراٹھی یہودی وہاں بھی پہنچ گئے تھے اور ان کے مدفن بھی وہاں ہیں۔ اسی طرح کی چیزیں ملک یمن میں بھی ملتی ہیں۔ یمن کے شہر عدن میں موجود ایک یہودی قبرستان میں عبرانی زبان کے ساتھ مراٹھی دیوناگر رسم خط میں کتبے دیکھے جا سکتے ہیں۔

انڈیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور یہودیوں کا بے مثال اتحاد درج ہے اور اس تاریخ کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ❁❁❁

سائنس

بنیادی طور پر تو سائنس ایک منظم طریقۂ کار کے تحت کسی بات کو جاننے یا اس کا علم حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے، اس طرح کہ اس مطالعے کا طریقہ اور اس کے نتائج دونوں ہی بعد میں دوسرے دہرا سکتے ہوں یا انکی تصدیق کر سکتے ہوں یعنی یوں کہہ لیں کہ وہ قابل تکرار (replicable) ہوں اور اردو میں اس کو علم ہی کہتے ہیں۔ فی الحال سائنس کا کوئی ایسا ترجمہ کرنے (یا اگر کیا گیا ہے تو اس کو عام کرنے) کی کوئی باضابطہ کوشش نہیں کی گئی ہے کہ جو اس کو دیگر علوم سے الگ کر سکے اس لیے اس مضمون میں علم اور سائنس متبادلات کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں، لہٰذا یوں کہہ سکتے ہیں کہ مطالعہ کر کے کسی چیز کے بارے میں جاننا (یا ایسی کوشش کرنا) یعنی علم ہی سائنس ہے۔ انگریزی میں سائنس کا لفظ لاطینی کے scientia اور اس سے قبل یونانی کے skhizein سے آیا ہے جس کے معنی الگ کرنا، چاک کرنا کہ ہیں۔ مخصوص غیر فنونی علوم جو انسان سوچ بچار حساب کتاب اور مطالعہ کے ذریعہ حاصل کرتا ہے کہ لیے سائنس کے لفظ کا جدید استعمال سترہویں صدی کے اوائل سے سامنے آیا۔ ❁❁❁

مرزا شاہرخ سیر و شکار کے لیے دہلی سے کجلی بن تشریف لے جاتے ہیں

قسط اوّل

تحریر: ناصر نذیر فراق دہلوی

دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ

مرزا شاہرخ حضرت ابوظفر بہادر کے اولوالعزم فرزند دل بند تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی کو ان کی اتالیقی کی خدمت سپرد تھی۔ مرزا شاہرخ میں اپنے بھائیوں اور لال قلعہ کے اور بادشاہ زادوں کے خلاف ایک قسم کی بیداری اور ہشیاری تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے امیر تیمور کے نام کو بٹہ لگایا اور ہماری کاہلی اور بے علمی نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے مگر سور ما چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ وہ کس کس کے جی میں جی ڈالتے اور کسے کسے سمجھاتے اور سوتے سے جگاتے۔ وہ اپنی ہمت مردانہ کو سیر و شکار میں صرف کرتے تھے اور اپنا دل بہلاتے تھے۔

(۱)

ان کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کو دیکھ کر دور دور سے ہنر مند اور اہل حاجت ان کے حضور میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے جو کچھ بن پڑتا تھا ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ ایک دن ایک شخص ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا اور عرض بیگی سے کہا ”صاحب عالم بہادر کو خبر دو ایک سیاح آپ کے لیے عنقا پکڑ کر لایا ہے“۔ صاحب عالم نے عرض بیگی کو اشارہ کیا کہ اس سیاح کو حاضر کرو اور وہ شخص صاحب عالم کے روبرو لایا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پنجرا تھا جس پر ایک ریشمی بسنتی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے آداب کیا اور بسنتی اتاری تو معلوم ہوا چاندی کے تاروں کا ایک چھوٹا سا پنجرا ہے اور اس میں ایک پدڑی ہلدی میں زرد رنگی ہوئی بند ہے۔

مرزا شاہرخ: (اس چڑیا کو دیکھ کر) واہ واہ سبحان اللہ! نایاب چیز ہے۔ یہ عنقا تمھیں کہاں سے ملا؟... وہی لانے والا: حضور میں اسے کوہ قاف سے لایا ہوں۔

مرزا شاہرخ: تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تمھارا ہی کام تھا جو اتنی دور گئے اور اسے پکڑ کر لائے۔ یہ فرما کر صاحب عالم اٹھے اور اپنے دست مبارک میں وہ پنجرا لیا اور محل سرا میں تشریف لے گئے۔ آپ کی دادی شاہ عالم بادشاہ کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں، وہ پنجرا ان کے سامنے لے جا کر رکھ دیا اور کہا: دادی حضرت دیکھیے! ہمارے لیے ایک شخص مصیبت پیٹ کر عنقا لایا ہے۔

بیگم نے پنجرا اٹھا کر چڑیا کو غور سے دیکھا اور مسکرا کر فرمایا: نوج یہ عنقا نہیں ہے، یہ تو موئی دو کوڑی کی پدڑی ہے۔ نگوڑی کو ہلدی میں رنگ لیا ہے۔ جھوٹے پر خدا کی پھٹکار۔ ہائے دلی کے شہدے تم بادشاہ زادوں کو کیا کیا جُل دیتے ہیں اور کیسے کیسے سبز باغ دکھاتے ہیں اور اماں تم ایسے مومنا چومنا ہو کہ جو کسی نے کہہ دیا وہ تمھارے لیے آیت حدیث ہو گیا۔ کیا وہ عنقا لانے والا ابھی حاضر ہے یا دفان ہوا؟

صاحب عالم: وہ حاضر ہے۔

بیگم: اچھا تم باہر جا کر اس کی کان پکڑی کراؤ اور اس سے کہو کہ تم سلاطین کی آنکھوں میں جوتوں سمیت گھسنا چاہتے ہو اور ایسا جھوٹ بولتے ہو جو دہرا جائے نہ اٹھایا جائے۔

صاحب عالم: دادی حضرت! میں نے دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ یہ پدڑی ہے مگر وہ بیچارہ تو کسی آس پر ہی اسے عنقا بنا کر لایا ہے۔ خدا جانے اس کے بال بچے کتنے دن کے بھوکے پیاسے ہوں گے جو اس نے یہ جال بچھایا ہے۔

بیگم: تو اسے کچھ انعام دینا چاہتے ہو؟

صاحب عالم: بے شک وہ انعام کا ضرور مستحق ہے۔ وہ کیا جانے گا کہ میں صاحب عالم کے پاس عنقا لے کر گیا تھا۔

بیگم: تمھاری خوشی۔ دردانہ (لونڈی کا نام ہے) میرا صندوقچہ تو لے آ۔

دردانہ: جناب عالی! لونڈی ابھی صندوقچہ لائی۔

یہ کہہ کر دردانہ ایک کوٹھری میں گئی اور وہاں سے ایک صندوقچہ اٹھا کر لائی۔ بیگم صاحبہ کی پٹاری میں کنجیوں کا ایک گچھا پڑا ہوا تھا، اسے انھوں نے اٹھا کر ایک کنجی سے صندوقچہ کا قفل کھولا۔ لونڈی نے صندوقچہ کا ڈھکنا اٹھایا۔ صاحب عالم نے دیکھا صندوقچہ میں کوئی خانہ نہیں گویا ایک حوض ہے جس میں منہ تک اشرفیاں بھر رہی ہیں۔

بیگم: لو شاہرخ! رومال میں اشرفیاں لے لو۔ یہ کہہ کر بیگم صاحب نے بھر بھر مٹھیاں مرزا شاہرخ کے رومال میں ڈالنی شروع کیں، یہاں تک کہ رومال اشرفیوں سے بھر گیا۔ مرزا شاہرخ رومال سنبھالتے ہوئے باہر تشریف لانے لگے تو بیگم صاحب نے فرمایا: یہ عنقا بھی انھیں کے حوالے کرو جو لائے ہیں۔ یہاں ہم لوگوں سے اس کی رکھیا ہرگز نہ ہو گی۔

دادی جان کے فرمانے سے صاحب عالم نے دوسرے ہاتھ میں عنقا کا پنجرا بھی لے لیا۔ رومال اور پنجرا دونوں سیاح صاحب کو دے دیے اور فرمایا: یہ انعام ہے اور یہ تمھاری چڑیا ہے۔ ہمارے نوکروں کو اس کا رکھ رکھاؤ نہ آئے گا، تم اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ جب ہمارا دیکھنے کو جی چاہا کرے گا تو تمھارے ہاں سے منگا لیا کریں گے۔ عنقا والے عنقا کا پنجرا اور اشرفیاں لے کر بھاگے تو گھر آ کر آرام لیا اور اشرفیاں گنیں تو پوری آٹھ سو نکلیں؛ دلدّر پار ہو گئے۔

(۲)

حضرت ابوظفر بہادر شاہ: ولے بھی میر سنگی سنتے ہو۔

میر سنگی صاحب: کرامات پیر غلام بگوش ہوش سنتا ہے۔

حضرت ابوظفر بہادر شاہ: مرزا شاہرخ نہیں مانتا ہے، وہ شیر کا شکار کھیلنے کجلی بن جاتا ہے۔ ویسے تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لشکر ہے مگر اماں مجھے کسی پر بھروسا نہیں ہے، مگر تم پر اعتبار کرتا ہوں اور اس لیے اس کے ساتھ تمھیں بھیجتا ہوں تم شاہرخ کے ساتھ اس طرح رہنا جس طرح قافیہ کے ساتھ ردیف رہتی ہے، دم بھر کو اسے اکیلا نہ چھوڑنا۔ وہ من چلا آدمی ہے، ایسا نہ ہو کسی جنگلی ہاتھی یا شیر سے بھڑ جائے اور اپنی جان گنوادے۔

میر سنگی صاحب: جہاں پناہ حافظ و ناصر خدا ہے، اس ناچیز کی کیا حقیقت ہے۔ مگر یہ جان نثار ایک آن کو بھی صاحب عالم سے الگ نہ ہو گا اور جب تک یہ نمک خوار زندہ رہے گا، ان کے دشمنوں پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

الغرض مرزا شاہرخ بہادر نے مع اپنے رفیقوں کے دلی سے کوچ کیا اور دریائے جمنا پر جو ناؤں کا پل بندھا ہوا تھا اس پر سے گزر کر پہلی منزل غازی آباد پر کی اور اسی طرح منزل بہ منزل اور کوچ در کوچ سہارنپور اور روڑکی ہوتے ہوئے کلیر شریف پہنچے اور حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیری قدس سرہ العزیز کے مزار پُر انوار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے ہردوار اور کنکھل جابراجے اور ان مقامات کو دیکھ بھال کر گنگا کو عبور کر کے کجلی بن کی طرف مڑے۔ گنگا کے کنارے چلتے چلتے ایک روز شام کو ایک گاؤں کے پاس پہنچ کر خیمہ زن ہوئے، آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس کی زرد زرد کرنیں گنگا میں پڑ رہی تھیں اور مشرق کی طرف شفق اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ صاحب عالم اپنی بارگاہ کے آگے شامیانے کے نیچے کرسی پر بیٹھے بہنڈہ نوش فرما رہے تھے۔ جو گاؤں کے مرد اور عورتیں اور بچہ اور بوڑھے اور جوان یہ کہتے ہوئے دوڑے آئے کہ چلو رے دلی کے بادشاہ زادے کے درشن کر لیں۔ صاحب عالم کو جب ان گاؤں والوں کا یہ شوق اور یہ چاؤ معلوم ہوا تو آپ نے ایک خواص سے اشارہ کیا کہ ان لوگوں سے کہہ دو ہم نے تمھارے گاؤں کے پرلے کنارے پر گنگا کے اندر چھوٹی بڑی بٹیاں پڑی دیکھی ہیں۔ وہ ہمیں بہت پسند آئی ہیں۔ تم میں سے جو لوگ خوبصورت اور سڈول اور چکنی بٹیاں اٹھا کر لائے گا تو جو بٹیا ہمیں پسند آئے گی اس کا مول پانچ روپیہ اور بٹیا ناپسند ہو گی تو اس کے دو روپے دیے جائیں گے۔ اس وقت تم سب جاؤ اور کل صبح بٹیاں چن کر چھانٹ کر لاؤ۔ گاؤں والے خوش ہوتے ہوئے اپنے گاؤں کو چلے گئے اور دوسرے دن ایک چھکڑا بھر کر بٹیاں لے آئے۔ صاحب عالم نے حکم دیا کہ ہمارے مصاحب ان بٹیوں کو ملاحظہ کریں جو بٹیہ انھیں پسند آئے اس کے بدلے انھیں پانچ روپیہ اور جو ناپسند ہو اس کے بدلے دو روپیہ ان لوگوں کو دیں۔ اور یہ قصہ شام تک ختم ہوا، رات کے وقت جب صاحب عالم خاصہ نوش فرمانے لگے تو ایک مصاحب نے دست بستہ عرض کی کہ حضور نے آج ایک خزانہ ان گنواروں کو ناحق دے دیا۔ صاحب عالم نے ایک آہ کھینچ کر کہا ہمارے پاس خزانہ کہاں سے آیا جو کسی کو دے دیں گے۔ تم نے سنا نہیں وہ بیچارے یہ کہتے ہوئے آئے تھے کہ ہم دلی کے بادشاہ زادے کے درشن کرنے آئے ہیں۔ بادشاہ زادے کو بھی کچھ غیرت کرنی چاہیے تھی یا نہیں؟ وہ خالی خولی جاتے تو کیا جانتے کہ دلی کا بادشاہ زادہ ہے۔

(۳)

مرزا شاہرخ چلتے چلتے کجلی بن کے قریب پہنچ گئے اور انھوں نے دیکھا کہ زمین کا رنگ اور اس کی مٹی ہمارے ملک کی زمین اور مٹی سے الگ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سرزمین پر کبھی انسانوں کا گزر ہی نہیں ہوا ہے۔ میدان ہیں تو ویران ہیں، جھاڑیاں ہیں تو سنسان۔ جا بجا ندیاں ہیں اور نالے ہیں مگر نہ کسی ندی کا گھاٹ ہے نہ اتار ہے۔ کشتی اور ناؤ کہاں سے آئی، کوئی بستی کوئی گاؤں دور دور تک نہیں ہے۔

میر سنگی صاحب نے صاحب عالم کو مشورہ دیا کہ اجنبی جگہ ہے آج دوپہر دن سے کسی جگہ ڈیرا کیا جائے اور چار سوار چار طرف بھیجے جائیں، اگر کوئی بستی پائیں تو اپنے ساتھ دو ایک آدمی اس بستی کے لائیں اور ان لوگوں سے کجلی بن کا ٹھیک رستہ معلوم کر کے آگے بڑھا جائے اور یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ کجلی بن کے اندر کوئی جا سکتا ہے یا نہیں اور شیر ہاتھی اس میں کہاں کہاں رہتے ہیں۔ ان کا شکار کس طرح کیا جائے گا۔ صاحب عالم نے میر سنگی صاحب کی رائے کو پسند فرمایا اور چار سوار چار طرف دوڑائے گئے اور چار پانچ کوس آگے بڑھ کر ایک ندی کے کنارے ڈیرا کیا گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے تین طرف سے تین سوار ناکام پلٹ کر آئے اور انھوں نے کہا ہمیں کوئی بستی کوئی گاؤں اور کوئی آدمی نہیں ملا اور نہ ہم نے کسی سے رستہ پایا۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں میں پھنس پھنس کر نکلے ہیں اندازاً بیس بیس میل تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ مگر چوتھا سوار پورب کی طرف سے جو آیا تو اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لایا۔ صاحب عالم کے حضور میں دونوں آدمی اور وہ سوار پیش کیا گیا۔ دونوں آدمی لنگوٹی باندھے ہوئے تھے، ان کی صورت پر وحشت برستی تھی۔ ان سے بات کی تو وہ عجب طرح کی بھاشا بولتے تھے اور وہ بہت کم سمجھ میں آتی تھی۔ اور جو کچھ ان کی باتیں سمجھ میں آئیں وہ یہ ہیں۔

انھوں نے کہا اس جگہ سے دس کوس پر ہمارا گاؤں ہے۔ ہم کھیتی برائے نام کرتے ہیں، اس جنگل کی جڑی بوٹیاں اور ترکاریوں سے اور شکار کے گوشت سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہاں سے ہمارے گاؤں تک کجلی بن میں گھسنے کا کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ چھوٹے بڑے درخت ایسے پاس پاس ہیں اور ان کے ٹہنے نیچے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس کی عمر کے ایسے بچھے ہوئے ہیں کہ آدمی یا گھوڑا یا بکری تو بکری گیدڑ اور خرگوش اور مور بھی اندر نہیں جا سکتا نہ اندر سے باہر آ سکتا ہے۔ ہمارے گاؤں سے پچاس کوس پر ایک گاؤں اور بستا ہے، وہ بڑا گاؤں ہے اس کے پاس ہی ایک کجلی بن کا دروازہ ہے۔ دروازے سے یہ مراد ہے کہ وہاں جا کر بن کچھ چھدرا چھدرا ہو گیا ہے۔ اس گاؤں کا نام پلا ہے اور پلا میں ایک راجپوت رہتا ہے۔ وہ شیر کا شکار کھیلتا ہے اور کجلی بن کے اندر جایا کرتا ہے۔ آپ یہاں سے پلا جائیے اور اس راجپوت کو بلایئے اور اسے ساتھ لے کر کجلی بن جائیے اور شیر کا شکار کیجیے۔ مگر حضور آپ رات کو یہاں نہ ٹھہریں کیونکہ یہاں رات بجتی ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا رات کیونکر بجا کرتی ہے۔ گنواروں نے رات کا بجنا سمجھایا بھی مگر ان کی بولی ایسی اکھڑ تھی کہ رات بجنے کا مطلب کوئی نہ سمجھ سکا۔ ان سے کہا گیا تم رات کو ار دوئے معلیٰ میں رہو۔ صبح ہم بھی تمھارے ساتھ گاؤں کو چلیں گے اور وہاں سے پلا کو جائیں گے۔ مگر

وہ کسی طرح نہ ٹھہرے اور یہی کہتے رہے ہم یہاں ہرگز نہ ٹھہریں گے یہاں تو رات بجتی ہے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

میر سنگی صاحب نے جمعدار کو بلا کر سمجھا دیا کہ آج رات کو معمول سے زیادہ پہرا رہے، گنوار کہہ گئے ہیں کہ رات بجتی ہے اس سے زیادہ ان کا کہنا سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر وہ جو پتہ توڑ کر بھاگے ہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ رات کو یہاں کوئی جوکھوں ضرور ہے۔ جمعدار نے کہا، حضور! جہاں ڈرہے وہاں سپاہی کا گھر ہے۔ پہرا بھی دوہرا کیے دیتا ہوں اور رات بھر خود بھی کمر باندھے کھڑا رہوں گا۔ مجھے دیکھنا ہے کہ رات مردار کیونکر بجتی ہے، صاحب عالم کے اقبال سے ہم تو اپنے آگے فلک کی ہستی نہیں سمجھتے۔ البتہ کجلی بن کا پاس ہے، شیر لگتے ہوں گے یا ہاتھی ستاتے ہوں گے تو ہماری تلوار کے آگے وہ کیا ٹھہریں گے غرض جمعدار یہ کہہ کر سپاہیوں کو وردی پہنانے چلا، اس میں آفتاب غروب ہو گیا اور آس پاس کے درختوں پر ایسے پرند اور چڑیوں نے بسیرا لیا جو اس سے پہلے مرزا شاہرخ اور ان کے ساتھیوں نے نہ دیکھے تھے، ان کی آوازیں بھی کانوں کو الگ معلوم ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ رات عشا کی نماز پڑھ کر چھپر کھٹ میں جا کر لیٹ گئے۔ پاچپی کرنے والا پاچپی کرنے لگا۔ داستان کہنے والے نے داستان شروع کر دی اور گھڑیالی نے رات کے دس بجائے جو یکایک ان کے کان میں جھانجھ بجنے کی آواز آئی جو بہت سریلی اور دل کش تھی۔ اس اجاڑ جنگل میں جھانجھ کی آواز بڑھی اور دم بدم بڑھنے لگی اور صاحب عالم چھپر کھٹ پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا میر سنگی صاحب ہم سمجھے ان گنواروں نے جو کہا تھا کہ رات بجتی ہے۔ وہ اسی آواز سے مراد تھی۔ میر سنگی صاحب اور سب مصاحبوں نے کہا حضور نے بجا فرمایا، رات بجنے کا ان کا اسی آواز سے مدعا تھا اور ایک گھنٹے میں تو یہ معلوم ہونے لگا کہ جنگل ہزاروں اور لاکھوں جھانجھوں سے بھرا ہوا ہے اور ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ صاحب عالم گھبرا کر خیمے سے نکل کر باہر آ گئے ہیں اور حیرت میں مبتلا ہیں۔ رات کے بارہ بجے تو یہ آواز اس قدر بڑھی کہ صور قیامت کی تصدیق ہو گئی۔ آواز کی رفتار اس طرح تھی کہ ایک بار معلوم ہوتا تھا کہ جھانجھ آسمان پر سے بجتے چلے آتے ہیں اور آتے آتے سر پر آئے اور پھر کانوں کے اندر گھس گئے۔ پھر کانوں سے نکلے، سر پر پہنچے اور سر پر سے اونچے ہو کر آسمان کو اڑ گئے۔ جب وہ صدا اوپر جاتی تھی تو کچھ دھیمی معلوم ہوتی تھی اور جب نیچے آتی تھی تو کان کے پردوں کو پھاڑتی معلوم ہوتی تھی۔ اب کوئی آدمی ایک دوسرے کی بات بالکل نہ سن سکتا تھا۔ صاحب عالم میر سنگی صاحب کے کان میں بات کہتے تھے اور میر صاحب صاحب عالم کے کان میں مگر پھر سمجھ میں نہ آتی تھی اور اس شور اور ہولناک آواز نے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دی۔ ہر شخص کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گھڑی دو گھڑی میں دم نکل جائے گا۔ گھوڑوں نے اگاڑیاں پچھاڑیاں توڑ ڈالیں اور اردوئے معلیٰ سے نکل کر بھاگ گئے۔ ایک ہاتھی اور ہتھنی ساتھ تھی وہ دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے، دو ایک گھوڑے زمین پر گر پڑے اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ ان مسافروں کے لیے یہ رات قیامت کی رات بن گئی۔ صاحب عالم نے حکم دیا کہ تمام لشکر میں خوب روشنی کی جائے تاکہ ایک دوسرے کی صورت تو دیکھتا رہے مگر یہ حکم اشاروں میں دیا گیا۔ رات کے دس بجے سے رات کے دو بجے تک رات اسی دھوم دھام سے بجتی رہی اور انسانوں کے حواس خمسہ کھوتی رہی۔ صاحب عالم اور میر سنگی صاحب دوات قلم لے کر بیٹھ گئے اور لکھ لکھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ رات ڈھلنے کے ساتھ رات بجنے کی صدا بھی دھیمی ہونے لگی یہاں تک کہ صبح کے وقت بالکل موقوف ہو گئی۔

شاہ خاور مشرقستان سے نکل کر صاحب عالم کے لیے اردوئے معلیٰ میں حاضر ہوا تو خاص و عام نے ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر کہا تمھاری صورت بالکل زرد ہو گئی ہے۔ صاحب عالم نے اور میر سنگی صاحب نے جو آئینہ دیکھا تو فی الحقیقت اپنے اپنے منہ یرقان زدہ پائے یا ہلدی کا اوبٹنا ملا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رات بھر کوئی انسان حیوان سویا نہ تھا اور نہ کسی نے آرام پایا تھا، اس واسطے سب پر سستی کاہلی چھائی ہوئی تھی۔ میر سنگی صاحب نے صاحب عالم سے کہا کہ فوراً کوچ کا حکم دیا جائے کیونکہ یہ مقام زہر ہے، ایک رات رہنے سے آدمی اور جانور مردہ ہو گئے ہیں اگر دو ایک دن یہاں اور رہے تو شاید سب کا کام تمام ہو جائے۔ صاحب عالم نے فرمایا آپ درست فرماتے ہیں اور اسی وقت روانگی کا حکم دے دیا۔ اردوئے معلیٰ پہلے سے چلنے کا بندوبست کر چکا تھا، صاحب عالم کے حکم کے ساتھ ہی سب وہاں سے چل دیے اور بھاگا بھاگ اس گاؤں پر پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے جس سے کل دو گنوار پکڑے آئے تھے۔ گاؤں والوں نے کہا بہت اچھا ہوا آپ وہاں سے اٹھ آئے، اس جگہ کا خاصہ ہے کہ باہر کا جو چرند پرند یا کوئی آدمی وہاں آ کر ٹھہر جاتا ہے تو اس آواز کو سن کر تین دن میں اس کا خون خشک ہو جاتا ہے اور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ میر سنگی صاحب نے ان سے کہا تم آخر پاس کے رہنے والے ہو تم نے بھی سمجھا کہ یہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ ان لوگوں نے کہا ہم کیا ہمارے بڑے بڑے ہزاروں برس سے اس گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں مگر یہ بھید کسی کو نہ معلوم ہوا کہ رات کیوں بجتی ہے اور رات ڈھلنے کے ساتھ اس کی آواز کیوں کم ہوتی جاتی ہے، اسی وجہ سے ہم لوگوں نے اس کا نام رات بجنا رکھ لیا ہے کہ باجن بجتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

(۴)

اس گاؤں میں جس کا نام یاد نہیں رہا پھر صاحب عالم نے کوچ کیا اور بہت زحمت اور تکلیف اٹھا کر پلا گاؤں تک پہنچے کیونکہ اس سے پہلے گاؤں سے پلا تک نہ کوئی لیکھ تھی نہ کوئی بٹیہ تھی، نہ پگ ڈنڈی تھی۔ جب آدمی ہی نہ ہوں تو لیکھ اور پگ ڈنڈی کس طرح بنتی۔ صاحب عالم نے پلا کے کنارے پر قیام فرمایا اور راس شکاری راجپوت سنگھ کو بلوایا۔ اس راجپوت کا نام یاد نہیں رہا، اس لیے میں ضرورت کے لیے راجپوت سنگھ لکھوں گا کیونکہ اس کا جا بجا ذکر آئے گا۔ راجپوت سنگھ حکم پہنچتے ہی حاضر ہوا۔ وہ بھی جنگلی بھاشا بولتا تھا۔ صاحب عالم نے اس سے کجلی بن کا حال اور شیر کے متعلق جو اس سے پوچھا تھا اس کا یہ جواب دیا۔ راجپوت سنگھ: جناب عالی بن کا نام کجلی بن نہیں ہے بلکہ گجلی بن ہے کیونکہ گج سنسکرت زبان میں ہاتھی کو کہتے ہیں۔ اس بن میں جو ہاتھی رہتے ہیں اس کا نام گجلی بن رکھا گیا تھا مگر بگڑ کر گجلی بن سے کجلی بن ہو گیا۔ ہمارا گاؤں ایک راجا کی حکومت میں ہے۔ ہم اپنے گاؤں کی پیداوار میں سے تھوڑی سی جنس دھان کی اس راجا کو اُگاہی کے طور پر دیتے ہیں سنا ہے وہ

راجا تھوڑا سا روپیہ بادشاہ کو دیتا ہے۔

کجلی بن ہمارے اس گاؤں سے سات کوس دور ہے اور سینکڑوں کوس تک چلا گیا ہے۔ اس کے اندر بعض درخت دو دو ہزار برس کی عمر کے ہیں اور سال، ساگوان، ابنوس، ہلدو اور قسم قسم کے درخت جن کے تنے ہاتھیوں کے کمر برابر اور ان سے زیادہ گولائی کے ہیں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ اور ان کی اونچائی لمبائی اتنی ہے کہ دیکھنے والا گمان کرتا ہے کہ ان کی پھننگیں اور چوٹیاں آسمان سے جا لگی ہیں۔ شیر، ریچھ، بندر، لنگور، ہاتھی، سار دھول، بھیڑیے، گیدڑ، لومڑی، ہرن، پاڑھے، چیتل، نیل گائے، بارہ سنگے، سور اور ہزاروں قسم کے چرند اس میں رہتے ہیں کہ راجا ہیر بکر ماجیت کے زمانے سے لے کر اور مسلمان بادشاہوں کی عملداری سے اب تک عمارت کے کام کی لکڑی اس بن میں سے ٹھیکہ دار لوگ کاٹ کر بھیجتے رہے اور اب بھی بھیجتے رہتے ہیں مگر اس کا ایک کونا بھی خالی نہیں ہوا ہے۔ اس بن کے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے، آدمی اس کی سیر کرتا ہوا یا شکار پر داؤ کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور شام ہو جاتی ہے اور پھر اسے پلٹنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ رستہ کا تو کوئی نشان ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے پھر کر کیونکر آئے۔ اندھیرا ہوتے ہی شیر اس کا شکار کر لیتے ہیں یا بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ یا ریچھ بندر اس کے ٹکڑے اڑا دیتے ہیں یا ہاتھی اسے کچل ڈالتے ہیں۔ لکڑی کاٹنے والے مزدور سو سو دو دو سو اکٹھے ہو کر کام کرتے ہیں، ایک جگہ ٹھیکیدار اپنا ڈیرا ڈالتا ہے اور ڈیرے کے آس پاس ایندھن انبار کر کے شام کے وقت اس میں آگ لگا دیتا ہے۔ بن کے جانور کیا ہاتھی کیا شیر سب آگ سے ڈرتے ہیں اور آگ دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ٹھیکیدار کے ساتھ ایسے بڑے بڑے مضبوط چھکڑے ہوتے ہیں جن میں پچاس پچاس اور سو سو بیل جوتے جاتے ہیں اور ان چھکڑوں پر شہتیر اور موٹے موٹے لٹھے لاد کر دور دور لے جاتے ہیں۔ اس محنت سے بہت سے بیل مر جاتے ہیں۔ میں سو پچاس بار شکار کی وجہ سے بن میں داخل ہوا ہوں اور چالیس چالیس پچاس پچاس کوس تک اس کے اندر چلا گیا ہوں تو میں نے اس میں میدان بھی کف دست پائے ہیں۔ ندی نالے بھی زور شور سے بہتے دیکھے ہیں۔ چشمہ جھیلیں اور قدرتی تالاب بھی بہتے ہیں اور ان ندی نالوں پر مختلف قسم کے پرندے دکھائی دیے ہیں۔ یہ بھی میں نے جانچ کی کہ بن کی بسنے والی مخلوق نے بن کو اپنے لیے بانٹ لیا ہے۔ کہیں خصوصیت کے ساتھ ریچھ، کسی ٹکڑے میں بندر، کسی میں ہرن، کسی میں ہاتھی اور کہیں شیر رہتے ہیں۔ تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جانور اپنی سرحد سے دوسرے جانوروں کی سرحد میں مصیبت پڑنے پر جا کر گھستے ہیں۔ مگر شیر ہر حصہ میں بن کے اور جانوروں کے ہر سرحد میں چلا جاتا ہے۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ سب جانوروں کا مہاراجا ہے اور سب جانور اس کی رعیت ہیں۔ جن علاقوں میں خاص کر شیرنیاں رہتی ہیں اور بچہ دیتی ہیں اور شیروں کے گرمی اور سردی کے رہنے کے جنگل مجھے اور میرے عزیزوں کو معلوم ہیں۔ ان اپنے عزیزوں میں سے فدوی ایک دو آدمیوں کو حضور کے ساتھ بھیج دے گا اور جب تک حضور شکار کھیلیں گے وہ حضور کے ساتھ رہیں گے۔ شیر کا شکار یہ غلام بھی کرتا ہے اگر حضور فرمائیں تو پہلے میں شکار کر کے اپنے کرتب دکھاؤں یا جب حضور اپنے قاعدے سے شیر کا شکار کر لیں تو غلام کو یاد فرمائیں غلام حاضر ہو کر اپنے شکار دکھائے۔ صاحب عالم نے خیال کیا کہ میں راجپوت سنگھ سے اگر یہ کہوں گا کہ تم شیر کا شکار دکھاؤ تو سمجھے گا کہ بادشاہ زادے کو شیر کا شکار نہیں آتا ہے، اس لیے کہا ہم اپنے طور پر شکار کھیلنا چاہتے ہیں، جب ہم شیروں کا شکار کر کے اپنا جی بھر لیں گے تو تمہیں بلا کر تمہاری ہنرمندی دیکھیں گے۔ البتہ تم اپنے دو تین آدمی رہبری کے لیے ہمارے ساتھ کر دو۔

❁❁❁

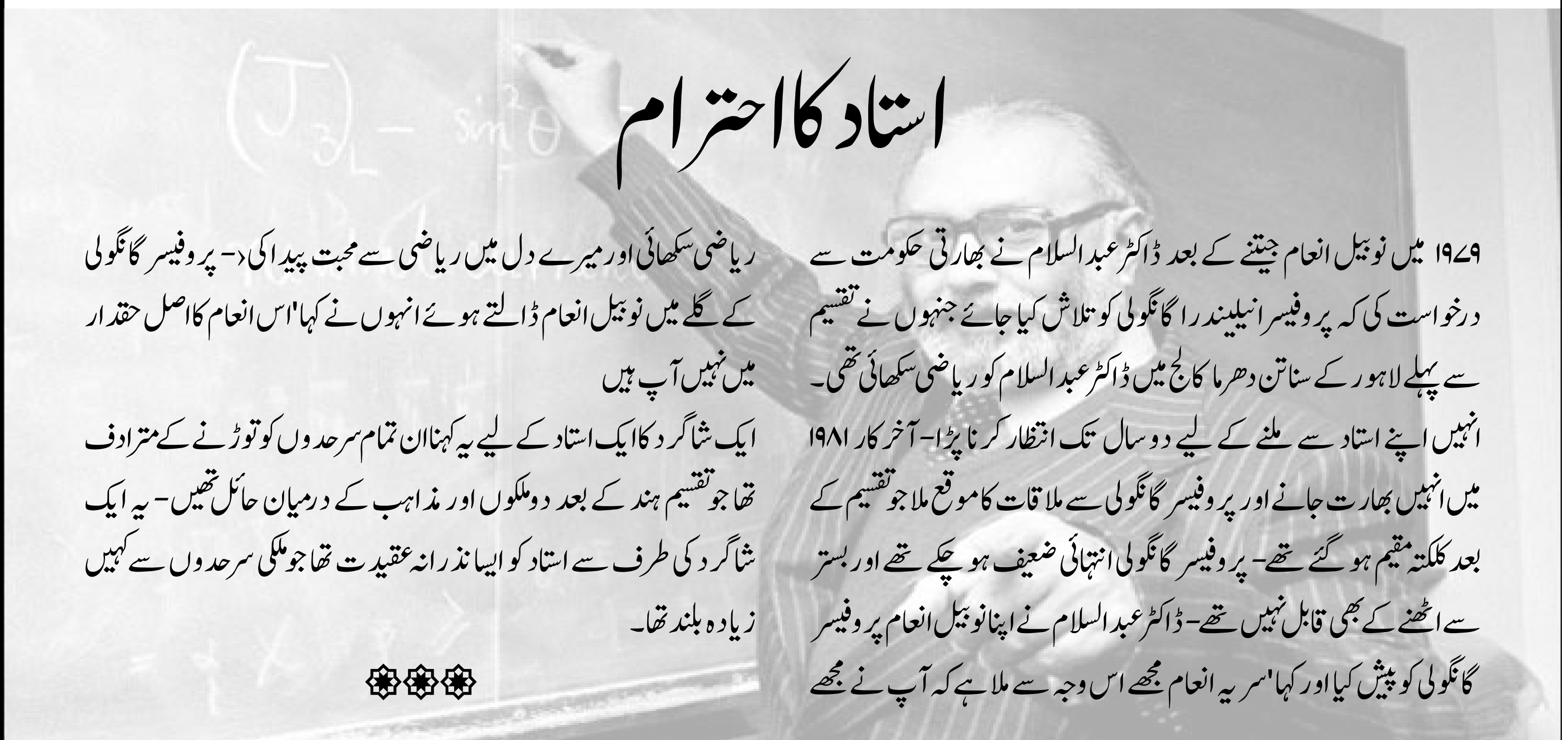

استاد کا احترام

۱۹۷۹ میں نوبیل انعام جیتنے کے بعد ڈاکٹر عبد السلام نے بھارتی حکومت سے درخواست کی کہ پروفیسر انیلیندرا گانگولی کو تلاش کیا جائے جنہوں نے تقسیم سے پہلے لاہور کے سناتن دھرما کالج میں ڈاکٹر عبد السلام کو ریاضی سکھائی تھی۔

انہیں اپنے استاد سے ملنے کے لیے دو سال تک انتظار کرنا پڑا- آخر کار ۱۹۸۱ میں انہیں بھارت جانے اور پروفیسر گانگولی سے ملاقات کا موقع ملا جو تقسیم کے بعد کلکتہ مقیم ہو گئے تھے- پروفیسر گانگولی انتہائی ضعیف ہو چکے تھے اور بستر سے اٹھنے کے بھی قابل نہیں تھے- ڈاکٹر عبد السلام نے اپنا نوبیل انعام پروفیسر گانگولی کو پیش کیا اور کہا 'سر یہ انعام مجھے اس وجہ سے ملا ہے کہ آپ نے مجھے ریاضی سکھائی اور میرے دل میں ریاضی سے محبت پیدا کی<- پروفیسر گانگولی کے گلے میں نوبیل انعام ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا 'اس انعام کا اصل حقدار میں نہیں آپ ہیں

ایک شاگرد کا ایک استاد کے لیے یہ کہنا ان تمام سرحدوں کو توڑنے کے مترادف تھا جو تقسیم ہند کے بعد دو ملکوں اور مذاہب کے درمیان حائل تھیں- یہ ایک شاگرد کی طرف سے استاد کو ایسا نذرانہ عقیدت تھا جو ملکی سرحدوں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔

❁❁❁

انسان نے لباس کب پہننا شروع کیا؟

ضرورت سے فیشن تک کا سفر

تحریر: اینڈی مارٹن

لباس کا آغاز ہماری حفاظت اور گرم رکھنے کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہوا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ خواہش کی چیز اور برتری کی علامت بن گیا۔

اس بات کا جواب تلاش کرنے میں بنی نوع انسان کو دس لاکھ سال لگے کہ کپڑے کیسے بنائے جائیں۔ یہ مرحلہ ان ادوار کے دوران میں کسی وقت طے پایا جب ہم اپنے جسم سے بال گرا کر ننگ دھڑنگ بندر بننے لگے اور جب ہم نے پہلی بار جانوروں کی کھال اوڑھنی شروع کی۔

آثارِ قدیمہ کو دیکھا جائے تو کافی مناسب شواہد ملتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ پتھر کے ابتدائی دور کے تقریباتی ملبوسات اور فر کوٹ کی باقیات بڑی تعداد میں آپ کو مل جائیں گی۔ ہمارے پاس تین ہزار سالہ قدیم اونی پتلونیں موجود ہیں، جن کا ٹانگوں والا حصہ آراستہ ہے (جو وسط ایشیا کے خانہ بدوش گھڑ سوار پہنتے تھے)۔ آلسی کے چند ٹیڑھے میڑھے ٹانکوں والے قدیم ترین چیتھڑے جو ہمارے پاس موجود ہیں وہ تقریباً ۳۴ ہزار سال پرانے ہیں۔

لیکن ایسے ساز و سامان کے زیادہ قدیم شواہد ملتے ہیں جو کپڑے بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے نوادرات دریافت ہوئے ہیں جیسا کہ جانوروں کی کھال سی کر قابل استعمال لباس بنانے والی سوئیاں اور سُوئے جو تقریباً ۵۰ ہزار سال پرانے ہیں (خاص طور پر سائبیریا کے غار ڈینی سوواسے)۔ یہاں تک کہ فراخ دلی سے رعایت دینے اور کھرچنے کے خام آلات شامل کرنے کے باوجود کپڑوں کے ابتدائی نمونے محض ایک یا دو لاکھ سال قبل ہومو سیپینز تک جاتے ہیں (پسو جو کپڑوں میں رہتے ہیں ان کی ابتدائی تاریخ تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار سال پرانی ہے)۔ سو یہ بات واضح ہے کہ ہمارے آباؤ و اجداد ہومینیڈ کم سے کم دس لاکھ سال تک بالکل ننگے پھرتے رہے۔

موسم (افریقہ میں) اور بھاگنا (چاہے درندے سے بچنے کے لیے یا کسی جانور کا شکار کرنے کے لیے) دونوں نے ہمیں گرم رکھا۔ دراصل برہنگی کا تصور غلط زمانے سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بات بھلا کیسے جان سکتے تھے کہ ہم ننگے ہیں جب تک ہمارے پاس ننگا نہ ہونے کی سہولت موجود ہو؟

لباس کی ایجاد کے بعد ہی ہم پر منکشف ہوا کہ ہم تو پہلے برہنہ تھے۔ ’نیکڈ‘ لفظ وجود میں آیا یعنی لباس کے بغیر۔ بالآخر جب غاروں کے اندر مصوری کا آغاز ہوا تقریباً اس کے ساتھ ہی پورنوگرافی بھی وجود میں آئی۔ بائبل نے اسے الٹے سرے سے پکڑا ہے: یہ انجیر کے پتوں کا بطور لباس استعمال تھا جس کی وجہ سے ہمیں اس وقت برہنگی محسوس ہوئی جب ہمارا جسم انجیر کے پتوں سے محروم ہوا۔

’ون ملین ایئرز بی سی‘ فلم (جس کی تشہیر اس نعرے سے کی گئی کہ ’تب بالکل ایسا ماحول تھا‘) میں راکیل ویلچ کی جانور کی کھال سے بنی ناتراشیدہ دلکش بکنی کو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کی طلب رسد سے آگے بڑھ گئی۔ جب ہم افریقہ سے خطرناک سفر پر نکل کھڑے ہوئے اور بالآخر سائبیریا اور الاسکا جا پہنچے اور جب ہمیں برفانی ادوار نے آلیا، تب لباس نے ہمیں بڑھتی ہوئی سرد ہوا سے بچایا۔ سردی کے سبب اعضا کو نیم جاں ہونے سے بچانے کے لیے ہم نے بہت سے التزام کیے اور اس طرح زیر جامہ پہننے کا آغاز ہوا، مگر جو ضرورت تھی وہ ایک مزے دار چیز بھی تھی اور اس لیے اس کی تمنا بھی کی جانے لگی۔ لباس حرص کی چیز بن گیا۔ اس کا تبادلہ اور چوری بھی ہو سکتی تھی اگرچہ لباس کے اصل مالک کی تقریباً لاش پر سے گزرنا پڑتا تھا، جس کے بعد ہی آپ اسے پہن سکتے تھے۔

لیکن لباس نے ہمارا سوچنے کا انداز بھی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ ہمارے دماغوں نے پوشیدہ رکھنے کا تصور اپنے اندر بساتے ہوئے ہمیں سازشی منصوبہ ساز لیکن اعصابی مریض بنا دیا جیسا کہ ہم آج ہیں۔

یونیورسٹی آف سڈنی میں قبل از تاریخ کے ماہر اور موسم، لباس اور زراعت قبل از تاریخ کے آئینے میں (Climate,Clothing and Agriculture in Prehistory) نامی کتاب کے مصنف این گلیگن اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس ابتدائی ’ٹیکنالوجی‘ کے انسانی ارتقا بالخصوص زراعت کی ترقی میں کئی طرح کے اثرات ہیں۔ زراعت محض کھانے پینے تک محدود نہیں تھی۔

گلیگن ۱۲ ہزار سال قبل گلوبل وارمنگ کے واقعے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں جو وسط حیاتیاتی دور (Pleistocene) اور ہولوسین (Holocene) کے درمیان میں کہیں پیش آیا۔ موسم زیادہ گرم اور زیادہ مرطوب ہو گیا۔ ہم اس مرحلے پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمارے لیے پورا لباس اتار پھینکنا ممکن نہ رہا تھا۔ خود کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ہم مجبوراً جانوروں کی کھال سے کپڑوں تک آ گئے۔ روئی خود بخود ایک بیش قیمت تجارتی چیز بن گئی۔ بالکل جیسے منطقہ حارہ کے خطوں کے لیے جنگلی کیلے کے ریشے۔ ہم اناج بھی اگا رہے تھے لیکن ہماری زیادہ توجہ ایسی اجناس اگانے پر تھی جس سے کپڑے بنائے جا سکیں اور بھیڑ بکریاں، لاما اور الپاکا کے ریوڑ پالنے پر

تاکہ ان کی اون کاٹی جا سکے۔

گلیگن کہتے ہیں، 'یہ سمجھنا کافی مشکل ہے کہ قبل از تاریخ کے عہد میں گھوم پھر کر شکار کرنے والے انسان نے محض خوراک کے حصول کے لیے کیوں زراعت کا پیشہ اختیار کیا ہوگا اور شاید اس نے ایسا کبھی نہ کیا ہو۔' ہم گھوم پھر کر ایسے ہی شکار سے خوراک اکٹھی کرتے رہتے لیکن پہننے کے لیے چمڑے اور پشم سے کم گرم، نفیس کپڑوں کے جوڑوں کی ضرورت نے ہماری آوارہ گردی پر بند باندھا اور ہمیں ایک جگہ ٹھہرنے، مہذب بننے اور دھاگے سے کپڑا بننے پر مجبور کر دیا۔

لوگ جو کچھ پہنتے ہیں، اس کا ذکر بائبل اور قرآن میں ملتا ہے۔ یوسف کا 'شاندار رنگ برنگا کوٹ' یا 'کئی رنگوں والے کوٹ' سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے مخصوص طرز کا لباس پہلے سے ہی ایک امتیازی حیثیت کا نشان تھا یا با آسانی حسد اور تشدد ابھار سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑے تیار کرنے والے اوزاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ 'سو ایک مالدار شخص کے جنت میں داخل ہونے کی نسبت ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا زیادہ آسان ہے۔' ریشم دنیاوی مال و دولت کی علامت ہے اگر دانائی کی نہیں تو۔ اس کے برعکس جوتوں کے بغیر گھومنا غربت کی علامت ہے۔ گناہ گار فقط ٹاٹ کے کپڑوں اور راکھ کے حقدار ہیں۔ لیکن اچھے ملبوسات تقدس کے ساتھ مخصوص کیے گئے۔ پادری بڑے بڑے جبے پہنیں گے کہ یہ خدا سے زیادہ قربت کا اشارہ کرتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں کپڑے بہت جلد خالص ضرورت سے ہٹ کر علامتی روپ اختیار کر گئے۔ اسی طرح اس کے برعکس ہوا کہ بالکل ہی مادر زاد ننگا پھرنا یا انتہائی مختصر واجبی سا لباس پہننا جو پاگل پن اور جنسی بے ہودگی کا مترادف ہے، اسے ممنوع قرار دیا گیا یا ضابطے کا پابند بنایا گیا۔ اس بات پر کوئی حیرت نہیں کہ برہنہ پھرنے کے شوقین (جنہیں نیکڈ ریمبلر کہا جاتا ہے) بار بار گرفتار ہوتے رہے بالخصوص سکاٹ لینڈ میں۔ مگر ارتقائی عمل میں ہمارے اندر پیدا ہونے والی شرمساری کی خو کا تعلق محض اس بات سے نہیں کہ ایک بھیانک خواب میں آپ کسی شاہراہ تک پہنچیں اور تب اندازہ ہو کہ آپ تو کچھ پہننا ہی بھول گئے تھے بلکہ لباس کے عمومی رجحان سے ہے۔

اسی طرح ہمارے لباس نے ہمارے سوچنے کے انداز پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہاں تک کہ انجیر کے پتوں اور دھوتی باندھنے کے وقتوں سے ہی ہم نے 'ملبوس احساس' کی عادت اپنالی۔ درمیان میں کچھ چیزوں کو نظرانداز کرتے ہوئے آج کی بات کرتے ہیں کہ سوت کاتنے والی مشین کی ایجاد سے کپڑوں کی صنعتیں قائم ہونے اور برطانوی فیشن سٹور 'بوہو' کے عروج سے گزر کر آج ہم اس قبل از تاریخ کے خبط کے وارث ہیں کہ کیا پہنیں اور کیا نہیں۔

شکیلا فوربز بیل فیشن کے شعبے میں ایک ماہر نفسیات ہیں جو ممکن ہے ہمیں مارکوس کی (Marcos syndrome) عالمی بیماری سے بچالیں۔ وہ گلے میں جگمگاتا ہوا ہار ڈالا کرتی تھیں جس پر یہ الفاظ کندہ تھے 'پریشان مت ہوں، خوش رہا کریں۔' وہ اسے کھونے پر آج بھی سخت افسوس کا اظہار کرتی ہیں۔ 'وہ ہار کتنی آسانی سے بات شروع کرنے کا موقع فراہم کرتا تھا۔ وہ میرے لیے بند دریچے کھول دیتا تھا۔' بہت سی ٹی شرٹس پر اب اصل جملے یا نعرے یا چبھتے ہوئے فقرے لکھے ہوتے ہیں لیکن ہر لباس کوئی نہ کوئی پیغام دے رہا ہوتا ہے۔ یہ رومانوی جملے بتاتے ہیں کہ کپڑے محبت بھرے گیت جیسے ہیں، ایک رومانس کی طرح ہیں۔ ہم اپنے بارے میں جو تصورات رکھتے ہیں، یہ انہیں اندر سے نکال کر باہر لے آتے ہیں۔

فوربز بیل نے فیشن کی نفسیات یونیورسٹی کالج لندن سے پڑھیں اور لندن کالج آف فیشن سے ایم اے کیا۔ آخری سال میں ان کی تحقیق کا موضوع 'ملبوسات اور نسل پرستی' تھا جس میں ان کی توجہ اس بات پر رہی کہ سیاہ فام امریکی ٹریون مارٹن کی ہوڈی نے ان کے بہیمانہ قتل میں کتنا کردار ادا کیا۔ وہ فیشن اور نفسیات دونوں کی طالب علم تھیں اور اب اپنی ویب سائٹ فیشن از سائیکالوجی کے ذریعے دونوں کو ایک ساتھ لے کر چل رہی ہیں جہاں ملبوسات سے متعلق مہمان مصنفین کی تحریریں چھپتی ہیں اور ہماری روزمرہ زندگی پر پیچیدہ علمی نظریے لاگو کیے جاتے ہیں۔ صارف کا رویہ اور محرک شناخت کرنے کے لیے وہ 'نیکسٹ' اور 'سینز بری' جیسی کمپنیوں کے ساتھ بھی کام کرتی ہیں۔

فوربز بیل کہتی ہیں: 'میں ایک ہی مخصوص انداز کو ناپسند کرتی ہوں۔ ایک دن میں کریبیئن کے سالانہ میلے کی ملکہ ہو سکتی ہوں تو اگلے دن میں ایک محقق یا کاروباری خاتون یا لاابالی انسان ہو سکتی ہوں۔' اوپر دی گئی دو تصاویر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔

عالمی وبا سے پہلے وہ ہر سال ٹرینیڈاڈ کے سالانہ میلے میں جاتی تھیں۔ 'کپڑے ہتھیار ہیں۔ آپ کو انہیں جسم کی نمائش کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ نہ کہ چھپانے کے لیے۔' ان کا سالانہ میلے کے لیے رال پر مانند کا تیار کردہ مخصوص لباس Masquerader کے نام سے معروف ہے اور وہ Yuma بینڈ کا حصہ تھیں۔

تمام ملبوسات ہماری وابستگیوں کا اظہار ہیں۔ یہ ناگزیر طور پر ہماری نسلوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ماضی میں یہ mods vs rockers تھے۔ پھر یہ punk ہوئے، یا ممکنہ طور پر goth۔ فوربز بیل ہماری چند گہری فرقہ ورانہ درجہ بندیوں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ '۲۰۱۶ میں ایک مشہور فیشن ایڈیٹر آئے اور کہا کہ اگر میں سیاہ فام ماڈل کی تصویر بیرونی صفحے پر لگاتا ہوں تو یہ بکے گا نہیں۔ میں یہ بات غلط ثابت کرنا چاہتی تھی۔ یہ شدید نفسیاتی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔' انہوں نے تحقیقی مجلّے 'مارکیٹ ریسرچ' میں ایک مضمون شائع کیا جس میں بتایا گیا کہ سیاہ فام ماڈل کی تصویر سے آراستہ ایک پرفیوم کی خریداری کے لیے سیاہ فام لوگ زیادہ رقم خرچ کرنے کو تیار تھے۔ 'سیاہ اور گندمی رنگت والے افراد کی قوت خرید حیران کن حد تک مضبوط ہے۔ ہم ان کی نمائندگی میں اضافہ دیکھ رہے ہیں لیکن سیاہ فام فیشن ماڈلز نسبتاً اب بھی

کم نمائندگی رکھتی ہیں۔'

لیکن ہمارے ملبوسات ہمارے اپنے بارے میں احساسات کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ وہ آپ کی کیفیت خوشگوار بنا سکتے ہیں (یا بالکل اس کے برعکس کر سکتے ہیں)۔ فوربز بیل ایک تجربے کا حوالہ پیش کرتی ہیں جس میں لوگوں کو سپر مین والی ٹی شرٹ پہننے کو دی گئی تھی۔ انہوں نے ایسے پابند گروہ کی نسبت خود کو زیادہ مضبوط سمجھا جنہیں سپر مین کِٹ فراہم نہیں کی گئی تھی۔ وہ اس نتیجے کو 'قرین قیاس' کہتی ہیں کیونکہ ہمارے ذہنوں کی وابستگیاں زیادہ تر ثقافت کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ لیب والا سفید لباس پہننا دراصل آپ کو زیادہ سائنٹیفک بناتا ہے، ایک رسمی لباس آپ کو عسکری منصوبہ ساز کا روپ دیتا ہے۔

لیکن خالص جسمانی سکون بھی ان کی ایک بنیادی ترین ترجیح ہے۔ 'اگر آپ ایسے کپڑے پہنیں جو جسمانی ساخت کے مطابق نہیں تو وہ تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ وہ پہنیں جو آپ کے جسم پر موجودہ لمحے مناسب بیٹھتا ہے۔' جب میری ان سے بات ہوئی تب انہوں نے کھلی سفید شرٹ اور نیچے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ وہ کہتی ہیں: 'آرام دہ لباس آپ کو بہتر کام کاج کی آزادی دیتا ہے۔ آپ کو غیر مناسب لباس سے اپنی توجہ منتشر نہیں ہونے دینی چاہیے۔ سہولت شعور کے حصول میں معاون ثابت ہوتی ہے۔'

شہرہ آفاق امریکی گلوکار ایلوس پریسلے کے جمپ سوٹ کا ان کے شعور پر کس حد تک اثر تھا یہ معلوم نہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ یہ لباس کا ایک ٹکڑا ہی تھا جس پر ایلوس کے تمام نقالوں نے ساری توجہ مرکوز رکھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ میرے خیال کے مطابق یہ انجیر کے پتوں کے بعد تیار کیے گئے مضحکہ خیز ترین ملبوسات میں سے ایک تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی لباس ایسا نہیں جسے اعتبار بخشنے والا کوئی نہ کوئی موجود نہ ہو، چاہے کسی دوسرے کی نظر میں وہ کیسا ہی بھدا کیوں نہ ہو اور اس معاملے میں فوربز بیل کی بھی ایسی ہی رائے ہے۔ 'کنگ آف راک کے کردار میں خود کو پیش کرنے کے لیے ایلوس نے بے ڈھنگے اور بولڈ ملبوسات استعمال کیے۔ لباس ساز لباس کے استعمال سے فنکار کو اپنے کردار میں ڈھلنے کے لیے تعاون فراہم کرتے ہیں۔ یہ نمایاں ہونے کے ایک طریقے سے آگے کی بات ہے، یہ اس لباس سے وابستہ خصوصیات کو عملی شکل میں پیش کرنے کا اسلوب ہے۔ کوئی بھی اس جمپ سوٹ کو دیکھ کر یہ نہیں سوچے گا کہ وہ 'خطرے سے خالی' ہے، لوگوں کو لگے گا وہ 'بولڈ'، 'بے باک' اور 'سنسنی خیز' ہیں جو ڈیزائنر بل بیلو کے نپولین عہد سے متاثر ہونے کے عین مطابق ہے۔'

کپڑوں کی ہر الماری ایک مخصوص معاشرہ ہے جو اپنی ثقافت رکھتی ہے۔ اور یہ ناسٹیلجیا کو محفوظ رکھنے کی جگہ ہے۔ وہ تمام پرانے پارچہ جات جنہیں آپ پھینکنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اٹھارہ سالہ شکیلہ کی جسمانی ساخت کے مطابق فوربز بیل کے پاس کثیر تعداد میں پارٹی ڈریس ہیں۔ 'میں انہیں خود سے جدا نہیں کر سکتی، یہ وہ ہیں جو میں ہوا کرتی تھی۔ آپ کے کپڑے میموری باکس کی طرح ہیں۔ وہ آپ کو ماضی میں لے جاتے ہیں۔' اپنی کپڑوں کی الماری میں جھانکتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ اگر یہ اگلے چند ہزار برسوں میں دوبارہ کھولی گئی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ شاید مجھے غلطی سے کوئی پال سمتھ سمجھ لیا جائے۔ میں شاید ایک لیبل کو حد سے زیادہ پسند کرنے کی گنہگار ہوں۔

مگر کیا بات محض اتنی سی ہے کہ ہم بہت زیادہ کپڑے خرید رہے ہیں؟ کپڑوں نے کم و بیش یقینی طور پر نہ صرف انسانوں کو بلکہ پورے کرہ ارض کو کسی حد تک گرم بنانے اور یوں انسانوں کے رہنے کے لیے زیادہ تکلیف دہ بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ کچرے کی پیداوار اور پانی کے کثیر استعمال سے قطع نظر اب دنیا میں دس فیصد کاربن کے اخراج کی ذمہ دار کپڑا سازی کی صنعت ہے۔ ۲۰۲۰ میں اندازے کے مطابق ۱۰۰ ارب نئے لباس تیار کیے گئے تھے۔

ہم ان کی بہتات میں ڈوبنے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ اپنے ہی کپڑوں کی سختی کے ہاتھوں۔ میرے جاننے والے افراد میں سے جس کے پاس سب سے زیادہ کپڑے ہیں وہ ہے ایلسا۔ ان کے پاس فرش سے لے کر گودام کی چھت تک (اور وہ کافی اونچی چھت ہے) کپڑوں کے ہزاروں جوڑوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ ٹوپیوں کی بڑی تعداد، شوز، جوتے، ٹائیاں، ڈنر جیکٹس، واسکٹیں، رقص کے مخصوص لباس، ہر طرح کی پوشاکیں۔ مردانہ اور زنانہ دونوں۔

اگرچہ ان کے پاس اس کی معقول وجہ ہے کہ وہ تھیٹر اور فلم والوں کو لباس بیچتی ہیں۔ جب وہ کسی ایئرپورٹ پر اترتی ہیں تو انہیں انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ کنویئر بیلٹ پر مردوں کے درجنوں یا اس سے بھی زائد مختصر ٹراؤزر لگے ہوتے ہیں۔ اپنے سامان کے ساتھ مزید اضافی سامان لے جانے کے لیے انہیں واجبی سی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ جیسا کہ وہ بہت جامع انداز میں ساری بات کہہ ڈالتی ہیں 'میرے پاس بہت سارا گند بلا جمع ہے۔' شاید اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ وہ افسانوی کردار جیک ریچر کی طرح بننے کے خواب دیکھتی ہیں جن کے پاس صرف وہی کپڑے ہیں جو بدن پر پہن رکھے ہوں (اور جب وہ کسی دوسرے کے خون میں رنگے جائیں تو اتار کے پھینک دیتی ہیں) اور اپنی جیب میں محض دانت صاف کرنے والا ایک برش رکھتی ہیں۔

گوبل وارمنگ کے نئے عہد میں یہ ناگزیر ہے، مختصر لباس روزمرہ کا معمول بنتے جا رہا ہے۔ چاہے آپ برہنگی کے علمدار نہ ہوں لیکن یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ سب کچھ اتار پھینکنے میں، بالخصوص گرمیوں کی بے لباس تیراکی میں ایک آزادی کا احساس ہے۔ یہاں تک کہ ایسے پیشہ ور افراد جن کا ذریعہ معاش ہی کپڑے ہیں وہ بھی دوبارہ بے لباس ہونے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، چاہے مختصر وقت کے لیے ہی سہی۔

شاید دلی طور پر ہم سب ملین برسوں پہلے کے سنہرے دور میں لوٹ جانا چاہتے ہوں جب ہمیں اس بارے میں زیادہ فکرمند نہیں ہونا پڑتا تھا کہ ہم نے کیا پہنا ہوا ہے۔ 'پریشان مت ہوں، خوش رہیں' آج بھی ایک بہترین مشورہ ہے۔ ❁❁❁

ماحولیاتی تبدیلی عالمی وباؤں سے زیادہ ہلاکت خیز ہے

جنیوا: تاریخ میں پہلی بار ۲۲۰ سے زائد طبّی تحقیقی مجلّوں (میڈیکل ریسرچ جرنلز) نے مشترکہ اداریہ شائع کیا ہے جس میں سیاست دانوں، پالیسی سازوں، عوام اور بالخصوص امیر ممالک کو خبردار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کووِڈ ۱۹ وبا کو بنیاد بنا کر ماحولیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے ہنگامی اقدامات میں دیر نہ کی جائے۔ اس اداریئے کے مصنّفین میں دنیا کے مایہ ناز طبّی ماہرین کے علاوہ عالمی ادارہ صحت کے سربراہ، ڈاکٹر ٹیڈروس ایڈہانوم گیبریئسس بھی شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی ایک بیماری کے مقابلے میں ’’عالمی ماحولیاتی تبدیلیوں سے وابستہ خدشات کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ کووِڈ ۱۹ کی عالمی وبا ختم ہوجائے گی لیکن ماحولیاتی بحران کی کوئی ویکسین نہیں۔‘‘ یہ اداریہ بطورِ خاص اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ماحولیاتی تبدیلیوں سے متعلق اجلاس اور گلاسگو، برطانیہ میں نومبر ۲۰۲۱ کے دوران منعقد ہونے والی ’’کوپ ۲۶‘‘ عالمی ماحولیاتی کانفرنس کی مناسبت سے تحریر کیا گیا ہے۔

اس مشترکہ اداریئے میں زور دیا گیا ہے کہ ۲۰۱۵ میں ماحولیاتی تحفظ کے لیے عالمی ’’پیرس معاہدے‘‘ پر فوری اور غیر مشروط عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔

اداریئے میں ماہرین کا مؤقف ہے کہ ماحول اور صحت کا آپس میں براہِ راست تعلق ہے لہٰذا بڑھتی ہوئی ماحولیاتی خرابی کا نتیجہ اس دنیا میں رہنے والے اربوں انسانوں کے لیے، جن کی اکثریت غریب اور کم تر وسائل والے ملکوں میں آباد ہے، صحت کے شدید ترین مسائل کی صورت میں نکلے گا۔ ’’مستقبل میں عالمی عوامی صحت کو سب سے بڑا خطرہ کرہ ارض کے درجہ حرارت میں اضافے کو ۱ء۵ ڈگری سینٹی گریڈ سے کم رکھنے اور قدرتی نظام کی بحالی کے لیے مناسب عملی اقدامات کرنے میں عالمی سربراہان کی مسلسل ناکامیوں سے ہوگا،‘‘ مشترکہ اداریئے میں ماہرین نے خبردار کیا۔ اداریئے کے ایک حصے میں ’’ایسٹ افریقن میڈیکل جرنل‘‘ کے ایڈیٹرِ انچیف، پروفیسر لیوکوئے ایتوولی نے توجہ دلائی کہ غریب اور اوسط آمدن والے ملکوں نے تاریخی اعتبار سے عالمی ماحولیاتی تبدیلیوں میں بہت کم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود (امیر اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی پھیلائی ہوئی آلودگی کے باعث) ان غریب ممالک کو بدترین اثرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن میں عوامی صحت سے متعلق سنگین مسائل بھی شامل ہیں۔ لہٰذا امیر اور صنعتی ممالک کو ماضی میں اپنی کارگزاریوں کا ازالہ کرنے کے لیے (غریب ملکوں سے) زیادہ حصہ لینا ہوگا اور اس عمل کا ’’فوری طور پر آغاز کرتے ہوئے اسے مستقبل میں بھی جاری رکھنا ہوگا،‘‘ پروفیسر ایٹوولی نے لکھا۔

❋❋❋

سویڈن کی ملکہ کے محل میں بھوت بھی رہتے ہیں

سوئیڈن کے سرکاری ٹی وی چینلز پر جمعرات کے روز ایک دستاویزی فلم نشر ہونے والی ہے جس کے مطابق سوئیڈین کی ملکہ سلویا کو یقین ہے کہ ان کے شاہی محل میں بھوتوں کا سایہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سترہویں صدی کے 'ڈروٹننگھم پیلیس ‹میں اپنے 'چھوٹے بھوت دوستوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ 'یہ حقیقی طور پر بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اس سے آپ کو ڈر نہیں لگتا۔' سوئیڈن کے دارالحکومت سٹاک ہوم کے پاس واقع یہ پرانی عمارت ملکہ اور ان کے شوہر کنگ کارل پنج دہم گستاف کی مستقل رہائش گاہ ہے۔ اس محمل پر مبنی دستاویزی فلم 'ڈروٹننگھم پیلیس: اے رائل ہوم ‹ کو سرکاری چینل ایس وی ٹی نے تیار کیا ہے جو سویڈین میں جمعرات کے روز ٹی وی پر نشر کی جائے گی۔ ملکہ نے فلم بنانے والوں کو بتایا کہ ' کبھی کبھار آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ مکمل طور تنہا نہیں ہیں۔ ‹ انھوں نے اس بات پر زور بھی دیا کہ لیکن یہاں پر ان کے ساتھ رہنے والے دیگر ساتھی بڑے دوستانہ طور پر رہتے ہیں۔

اس فلم کے سلسلے میں جب کنگ کارل کی بہن شہزادی کرسٹینا کا انٹرویو کیا گیا تو انھوں نے بھی ملکہ کے دعوے کی تصدیق کی۔ شہزادی کا کہنا تھا: ' گھر میں بڑی توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہوگی اگر وہ کسی بھیس میں نمودار نہ ہو۔' ۷۳ سالہ ملکہ سلویا نے کنگ کارل سے ۴۰ برس قبل شادی کی تھی اور اس وقت وہ سوئیڈین کی سب سے طویل وقت تک رہنے والی ملکہ ہیں۔ وہ ایک جرمن تاجر اور برازیلی نژاد خاتون کی بیٹی ہیں۔ ۲۰۱۵ میں آنے والی ایک کتاب 'دی رائل ایئر ‹ کے لیے ایک انٹرویو کے دوران ملکہ سلویا نے بتایا تھا کہ پہلے سال انھیں بطور ملکہ مردوں کے اثر و رسوخ والے محل میں رہنے سے تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا: 'ہر شخص کی نیت ہمدردانہ تھی۔ سبھی میری حمایت میں تھے۔ اور کنگ تو بہت ہی زبردست تھے لیکن پھر بھی تنہائی کا احساس تو ہو سکتا ہے۔' انھیں کرسمس کے عین قبل ہی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں بھرتی کیا گیا تھا لیکن دو روز بعد وہ شفایاب ہو کر باہر آگئی تھیں۔ ❋❋❋

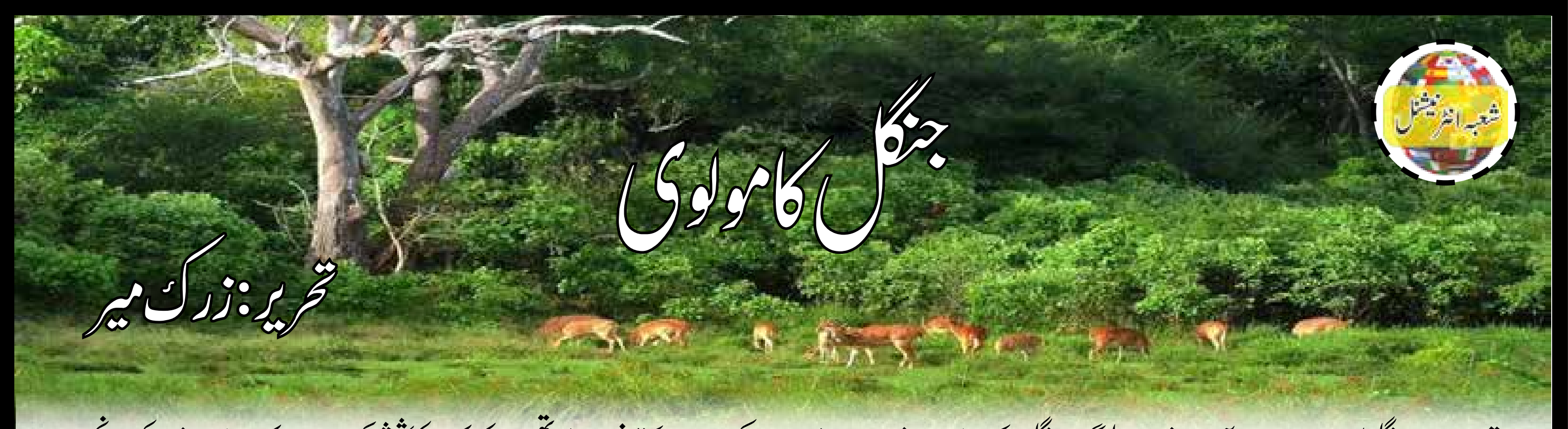

جنگل کا مولوی

تحریر: زرک میر

راتوں رات جنگل کا بندھنوں سے آزاد قانون بدل گیا، جنگل کے مولوی جانوروں نے درختوں پر چڑھ کر جنگل پر قبضہ کرلیا اور فیصلہ کیا کہ جنگل سے برہنگی اور بے پردگی کو ختم کرنا ہے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے بغیر بال والے ننگے جانوروں کو فتویٰ بھیج دیا کہ وہ اپنے جسم ڈھانپنے کا جلد از جلد بندوبست کریں اور جبکہ ایسے جانور جن کے جسموں پر بال بھی تھے اور وہ دم بھی رکھتے تھے انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی دمیں اپنی شرمگاہوں پر لٹکائے رکھیں اور انسانوں کی مونچھوں کی طرح انہیں تاؤ کی صورت میں نہ رکھیں کہ اس سے ان کی غیرت دکھائی دینے کی بجائے ان کی برہنگی ظاہر ہوتی ہے اور سب کچھ آشکار ہو رہا ہوتا ہے۔ لہذا زیادہ بال رکھنے والے اور دم لٹکا کر رکھنے والے جانور تو کچھ خیر سے رہے لیکن باقیوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ بالخصوص سانپ، چھپکلی جو بالکل فارغ البال تھے انہوں نے تو اپنے آپ کو انتہائی غیر محفوظ محسوس کیا جبکہ باقی جن کے جسم پر بال تھے اور ان کی دم بھی تھی مثلاً بندر، کتا، بکرا بکری وغیرہ وغیرہ، لیکن وہ ان کی دمیں شرمگاہوں پر لٹکی ہوئی نہیں تھیں وہ انسانوں کی مونچھوں کی طرح تاؤ دی ہوئی تھیں ان کو بڑا دھچکا لگا۔ وہ پہلے تو حیران رہ گئے کہ یہ شریعت ان پر کیسے نافذ ہوگئی ہے۔

البتہ آخر الذکر جانوروں کو اپنے مسئلے کا حل کچھ آسان لگا وہ اپنی دمیں تیل میں رکھنے لگے کہ انہیں انسانی مونچھوں کی طرح تاؤ کی صورت کی بجائے نرم کر کے نیچے لٹکایا جاسکے جس طرح انسان اپنی مونچھوں کو تیل لگا کر تاؤ دیتے ہیں لیکن دلچسپ صورتحال اس وقت سامنے آئی جب ان کی اپنی دموں کو نیچے لٹکانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

جبکہ سانپ چھپکلی اور عشرات الارض کو تو الٹی میٹم دیا گیا کہ وہ جلد از جلد اپنے جسموں کو ڈھانپنے کا کچھ بندوبست کریں ورنہ انہیں سنگسار کر کے جنگل بدر کیا جائیگا کیونکہ ان کا تو پورے کا پورا جسم یونہی ننگا نظر آنے لگا تھا جو بالدار مولوی نما جانوروں کی نیت خراب کرنے کیلئے کافی تھا۔ لیکن ان جانوروں جن کی دمیں ان کی شرمگاہوں پر لٹکتی رہیں ان کو ایک اور مسئلے کا سامنا رہا کہ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنی دودھ بھری تنوں کو چھپائیں ورنہ انہیں بھی سنگسار کیا جاسکتا ہے، مثلاً گائے بھینس وغیرہ وغیرہ۔

مولوی جانور مثلاً شیر چیتا بھیڑیا اور لگڑ بگا وغیرہ نے اپنی شرعی عدالتیں لگائیں اور انہوں نے ایسے جانوروں کا شکار عام شروع کر دیا اس دوران ہاتھی کچھ سکون سے رہا کہ اس کی جسامت یوں بھی بہت بڑی تھی اور عریانیت کے کچھ بھی آثار اس سے واضح نہیں ہوتے تھے اور تھا بھی کالا، تب شرعی فتوؤں کے زد میں آنے والے سارے جانور ہاتھی کے پاس گئے اور اپنی فریاد سنائی۔ سانپ چھپکلی اور دیگر حشرات الارض نے تو کہا کہ ان کیلئے بال رکھنا ممکن ہی نہیں رہا ہمیں تو قدرت کی طرف سے بھی بال عطاء نہیں کئے گئے ہیں جبکہ بکرا بکری بندر، کتا وغیرہ نے ہاتھی سے کہا کہ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی انسانوں کی مونچھوں کی مانند ٹیڑھی دموں کو سیدھا کر کے اپنی شرمگاہوں کو چھپائیں اس وقت تک ان کو مہلت دلادیں۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ کچھ دیر یہاں وہاں گھمائی اور کہا کہ اسے اس پر سوچنے کا موقع دیا جائے تاکہ میں اس پر کوئی مشورہ دے سکوں۔

اگلے دن جب پریشان حال سب جانور ہاتھی کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ہاتھی پر ایک انسان بیٹھا باقی ہاتھیوں کو شہر کی طرف ہانک رہا ہے، یہ پریشان حال جانور مزید پریشان ہو گئے، ان میں سے کتے نے کمال ہوشیاری سے جا کر ہاتھی سے پوچھ لیا کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔

ہاتھی نے کہا "یار و تم لوگ تو اپنی دموں کو اپنے شرمگاہوں پر لٹکانے میں کسی نہ کسی دن کامیاب ہوجاؤ گے لیکن میرے یہ دانت میرے لئے مصیبت بن گئے ہیں میں اپنی ان سفید اور برہنہ دانتوں کا کیا کروں جن کو میں کبھی نہ چھپا سکونگا۔ یہ انسانوں کو برہنہ اور خوبصورت لگے ہیں وہ ان کو نکالنے کیلئے ہمیں شہر لے جارہے ہیں" اور آپس میں بار بار کہہ رہے ہیں کہ ہاتھی کے دکھانے کے دانت اور کھانے کے اور۔ اور یہ کہ زندہ ہاتھ لاکھ کا اور مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا۔

تم لوگ بھاگو کہ یہ انسان آپس میں کہہ رہے ہیں کہ وہ کچھ جانوروں کا گوشت کھائیں گے جبکہ کچھ کا دودھ پیئیں گے، سانڈے اور اس جیسوں کے تیل سے انسان اپنے عضو تناسل کو مالش کرنے کا نسخہ بھی انہوں نے ڈھونڈ لیا ہے، بندروں کو گلی گلی نچانے، کتوں کو چوکیداری کیلئے جبکہ پہاڑی بکروں کو شکار کر کے ان کے سینگوں والے سر اپنے مہمان خانوں میں لٹکانے اور ان کو اپنی وحشت کی علامت "مارخور" کے طور پر استعمال کرنے کی ٹھان لی ہے۔ جبکہ سپیرے اور موچی سانپوں کو پکڑنے کیلئے آرہے ہیں تاکہ ان کی نمائش کی جاسکے اور ان کے چمڑے سے خصوصی نوابی خانی اور حیوانی جوتے بنائے جاسکیں۔

یہ سن کر بندر نے کہا "انسان میری نسل سے ہیں میں ان کی نفسیات جانتا ہوں کہ وہ یہاں ضرور آئے گا یہ اپنی سگریٹ سلگانے کیلئے اب تک جنگل کے جنگل ماچس کے طور پر پھونک چکا ہے۔ یہ بے چین شہ ہے۔

بکری نے کہا "پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے، ہاتھی نے کہا "اب یہ جنگل جنگل نہ رہا، اب یہ شہر بن چکا ہے۔ اب کہیں اور جا کر جنگل بسالو۔ یہ کہہ کر ہاتھی اپنے کانوں کو جنبش دیتے ہوئے انسانوں کی بستی کی جانب جانے لگا۔ ہاتھی کی باتوں سے خوف وہراس پھیل گیا دیکھتے ہی دیکھتے جنگل سے نکلنے کیلئے برہنہ بے پردہ، ٹیڑھی دم اور لٹکتے تنوں والے کافر جانوروں کا جنگل کی سرحد پر لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ جبکہ خونخوار لگڑ بگے اور بھیڑیئے ان کی جانب لپک لپک کر ان کو چھیڑ پھاڑ رہے تھے۔۔۔۔ گھمسان کا رن پڑا تھا ۞۞۞

ہماری کہانی

تحریر: وہاراامباکر

انسان کے آج تک کی سائنسی ترقی کی کہانی: مندرجہ ذیل ملیڈینو کی تحریر کا ترجمہ ہے
”میرے والد دوسری جنگِ عظیم میں قیدی تھے۔ وہ کالج نہیں گئے تھے۔ ایک ساتھی قیدی نے ایک ریاضی کا معمہ ان سے پوچھا۔ میرے والد کئی روز تک سوچتے رہے لیکن اسے حل نہ کر سکے۔ انہوں نے اس قیدی سے اس کا جواب پوچھا لیکن اس نے بتانے سے انکار کر دیا جیسے کہ وہ کسی راز کی حفاظت کر رہا ہو۔ والد نے اپنے تجسس کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ موت اور بدبو کے اس ماحول میں ان پر جواب جاننے کا جنون سوار ہو گیا۔ آخر اس قیدی نے ایک پیش کش کی۔ اگر میرے والد اسے اپنے حصے کا ایک وقت کا کھانا دے دیں تو وہ جواب بتا دے گا۔ بھوک اس قیدخانے کی ایک مستقل حقیقت تھی۔ لیکن تجسس کا یہ جذبہ اتنا طاقتور تھا کہ ان کے لئے یہ آسان سودا تھا۔

جب میرے والد نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں ہائی سکول میں تھا۔ اس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میرے والد کا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ ان کی ہر شے ضبط ہو چکی تھی۔ ان کا جسم فاقوں کا شکار تھا۔ تشدد کے نشان تھے۔ ان کی زندگی میں جو کچھ بھی معنی رکھتا تھا، ان سے چھینا جا چکا تھا۔ لیکن ان کی سوچ اور عقل، جاننے کا جذبہ بچ گیا تھا۔ ان کا جسم قید تھا لیکن ذہن نہیں۔ یہ وہ کہانی تھی جس نے مجھے سمجھا دیا کہ علم کی خواہش انسانی جبلتوں میں سب سے زیادہ انسانی شے ہے۔ میرے اور ان کے حالات میں بہت فرق تھا لیکن اس دنیا کو میرے جاننے کے شوق میں اور ان کے شوق کی جبلت ایک ہی تھی۔

میں نے کالج میں سائنس میں داخلہ لیا۔ میرے والد مجھ سے سوال پوچھتے۔ ٹیکنیکل باریکیوں کے بارے میں نہیں بلکہ جو میں سیکھ رہا تھا، ان کے معنی کے بارے میں۔ یہ تھیوریاں کہاں سے آتی ہیں؟ مجھے ان میں دلچسپی کیوں ہے؟ مجھے یہ اتنی پرکشش کیوں لگتی ہیں؟ یہ ہمارے انسان ہونے کے بارے میں ہمیں کیا بتاتی ہیں؟“۔

لاکھوں سال پہلے زمین پر کسی نوع نے سیدھا کھڑا ہونا شروع کیا تھا۔ دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے والی اس نوع کے اگلے دو ہاتھ آزاد ہو گئے تھے۔ اس دنیا کی کھوج لگا سکتے تھے۔ اس کو بدل سکتے تھے۔ سیدھا کھڑا ہونے سے نظر دور تک دیکھ سکتی تھی لیکن صرف نگاہ ہی نہیں، ذہن بھی دوسرے جانوروں سے بلند ہو رہا تھا۔ اس دنیا کی کھوج صرف ہاتھ اور نگاہ سے نہیں، سوچ سے بھی ممکن ہو رہی تھی۔ اور یہ اس نوع کی ممتاز خاصیت تھی۔ انسان ایک منفرد نوع ہے اور یہ انفرادیت جاننے کی جستجو کی جبلت ہے۔ اور ہزاروں سال سے اس نیچر کا معمہ حل کرنے میں مگن ہے۔ اگر کسی قدیم انسان کو مائیکروویو میں کھانا گرم ہوتے دکھایا جائے تو شاید وہ سمجھے کہ اس میں کوئی ننھی منی مخلوق آگ جلا کر اسے گرم کر رہی ہے جو دروازہ کھولنے پر غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن سچ کا معجزہ بھی اس سے کم نہیں۔ قوانین جو اٹل ہیں، مجرد ہیں اور یہ کائنات انہی کے مطابق چلتی ہے۔ کائنات کا یہ معجزہ ہمارے اردگرد بکھرا ہوا ہے۔

اب ہم لہروں کو چاند کی کشش سے سمجھ لیتے ہیں، جانتے ہیں کہ ستارے نیوکلئیر بھٹیاں ہیں جو ہم تک فوٹون بھیجتے ہیں۔ ہم دس کروڑ میل دور سورج کے دل کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھربوں گنا چھوٹے ایٹم کے سٹرکچر کو سمجھ رہے ہیں۔ صرف یہی قوانین نہیں، ان کو ڈی کوڈ کر لینا بھی معجزہ ہے اور یہ کھوج خود ایک شاندار کہانی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے میں سٹار ٹریک کے ایک سیزن کا مصنف تھا۔ ایک قسط کی کہانی کے دوران میں پروڈیوسر اور سکرپٹ رائٹر کو اپنے جوش میں سولر ونڈ کی آسٹروفزکس سمجھا رہا تھا۔ نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ میں رکا اور اپنے باس کو مسکراتے ہوئے دیکھا لیکن مجھے زبردست جھاڑ پڑ گئی۔ جب میری شرمندگی کم ہوئی تو مجھے سمجھ آیا کہ انہوں نے مجھے فزکس پڑھانے کے لئے نہیں، کہانی لکھنے کے لئے رکھا تھا۔ اس نکتے نے میری بہت مدد کی۔ قدیم زمانے سے آج تک ہم کہانیاں سننے والے ہیں۔ اور یہ ہمارے ذہن تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ غلط ہاتھوں میں سائنس بہت ہی بور اور خشک قسم کی شے بن جاتی ہے۔ لیکن اگر ٹھیک سے بتایا جائے کہ ہم کیا جانتے ہیں اور کیسے جانتے ہیں تو یہ الف لیلہ کی کہانی سے زیادہ دلچسپ ہے۔ دریافتوں کی اقساط، اس زمین کے غاروں سے نکل چاند تک جا پہنچنے کے ہمارے سفر کی داستان، جو سٹار ٹریک کی اقساط سے زیادہ سحرانگیز ہے۔ اس داستان کے کردار، ان کا ولولہ اور ان کی زندگی کی پیچیدگیاں کسی بھی قصہ گو کی کہانی سے کم نہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو ہمیں آج کی سوسائٹی تک لے کر آئے ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ ایک نوع جو بمشکل خود کو شکاری جانوروں سے بچاتی تھی اور جنگلی پھل اور جڑوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ اس سے بھاری بھرکم جہاز اڑا لینا، زمین کے دوسرے کنارے تک فوری پیغام رسانی پہنچا دینا، کائنات کے ابتدائی حالات کو لیبارٹری میں بنا دینا اور آپ کا یہ ایک سکرین پر یہ سب کچھ پڑھ لینا۔۔۔ اس کو جاننا، بطور انسان، اپنی وراثت کو جاننا ہے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ کیونکہ یہ انسان کی کہانی ہے۔

❁❁❁

دنیا کے سب سے بڑے چہرے ادیو گی شیوا کے بارے جانئے

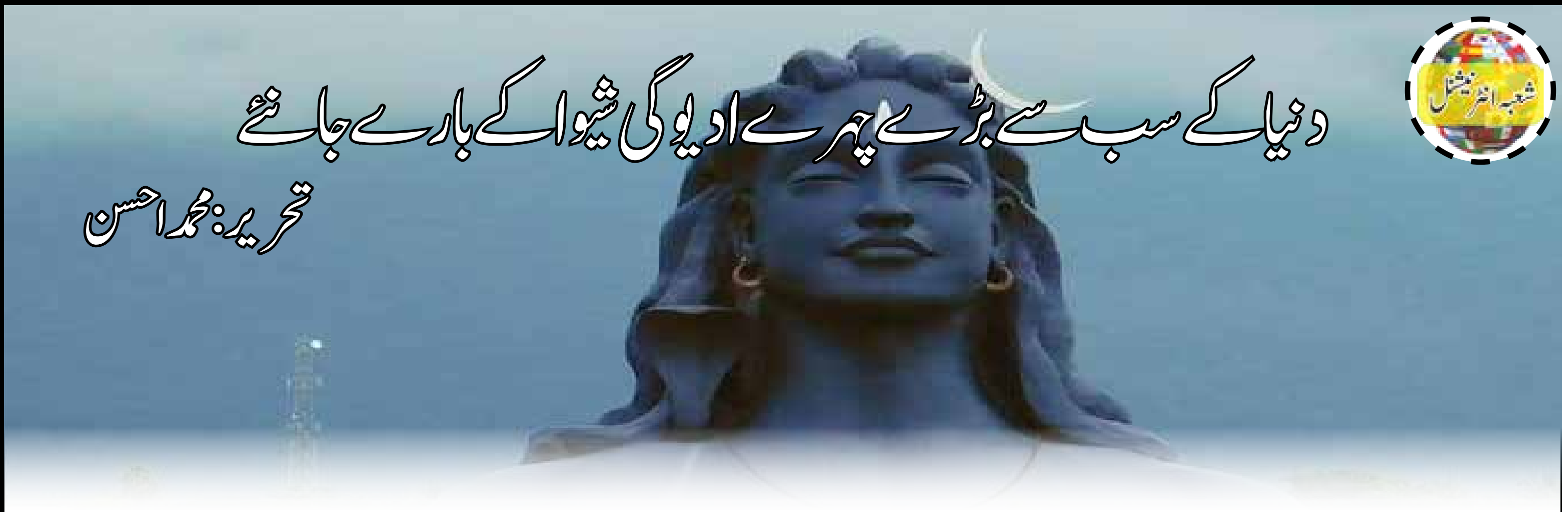

تحریر: محمد احسن

سب سے پہلے تو استغفراللہ، معاذاللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بڑائی صرف خدا کے لیے ہے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ ذرا ادیو گی شیوا کا سیاہ چہرا دیکھیے، واہ۔ بہت ہی زبردست۔ گینیز ورلڈ ریکارڈز میں یہ دنیا کا سب سے بڑا چہرا لکھا ہوا ہے۔ اس کی بلندی ۱۱۲ فٹ ہے۔ یوگا کے مطابق انسانی جسم میں موجود ۱۱۲ قابلِ عمل انرجی سینٹرز کی تعداد کی وجہ سے اس مجسمہ کی بلندی بھی ۱۱۲ فُٹ رکھی گئی۔

(دو مزید انسانی انرجی سینٹرز انسانی اختیار میں نہیں، وہ کائنات کے اختیار میں ہیں۔ کائنات اُن دو سینٹرز کے ذریعے ہر انسان سے یک طرفہ رابطہ رکھتی ہے۔ یعنی مکمل انرجی سینٹرز ۱۱۴ ہوتے ہیں۔ کیا قرآن میں سورتوں کی ۱۱۴ تعداد اسی جانب خفیہ اشارہ کرتی ہے؟ پتا نہیں)۔

اس چہرے پر سکون دیکھیے۔ سکون کا ایسا زبردست سمندر مجھے مزید دو پتھریلے چہروں میں نظر آتا ہے.. ایک تو ریوڈی جنیرو برازیل میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود یسوع مسیح کا چہرا اور دوسرا ٹیکسلا میوزیم میں دیو قامت گوتم بدھ کا چہرا۔ مگر ادیو گی شیوا کا چہرا اپنی سیاہی کی وجہ سے مزید پر اسرار ہو جاتا ہے۔

جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو کے پہاڑوں کے قریب مشہور سدھ گرو (واسُو دیو جو گی) کی خانقاہ "ایشا فاؤنڈیشن" موجود ہے، یہ مجسمہ سدھ گرو نے ایشا فاؤنڈیشن کے اندر بنوایا ہے۔ اکثر راتوں میں یہاں یوگا (جوگ) کی تقریبات ہوتی ہیں اور اُس دوران رات کی سیاہی میں سیاہ ہوتا ادیو گی کا مجسمہ مزید پر اسرار نظر آتا ہے۔

ادیو گی سے مراد "پہلا جوگی" یا مہا جوگی ہے۔ شیوا ہندو مت میں خلاؤں کا دیوتا ہے، اسی لیے سیاہ خلا کی نسبت سے سیاہ تاثر رکھتا ہے۔ شیوا نے ہی جوگ کی روایت شروع کی تھی۔ جوگ سے مراد ہے "خلا میں فنا ہونا"، عیسائیت میں اس نظریہ کو کمیونیئن (Communion) کہتے ہیں اور صوفی اسلام میں "فنا فی اللہ" کہا جاتا ہے۔ اب تو سائنسی فلکیات بھی یہی کہتی ہے کہ کائنات میں واحد موجود شے خلا ہے، باقی سب کچھ سیاہ خلا کی ہی اشکال ہیں۔ پڑھیے کوانٹم فزکس میں۔

بے شک مذاہبِ عالم کے ظاہری لبادے میں ہر مذہب کے پیروکار آپس میں لڑتے بھڑتے رہیں مگر مذاہب کی باطنی روایات (Mysticism) میں حیرت انگیز ہم آہنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر مسلم صوفیا کرام نے جوگی روایت کو استعمال کیا ہے.... کنے مندراں پا کے، نی مَیں جاناں جوگی دے نال۔ سکھ مذہب کا آغاز اسلامی تصوف سے شروع ہوا، حالات یہاں تک پہنچے کہ بابا فرید گنج شکر کا بہت سارا کلام سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ کا حصہ ہے۔ لاہور والے حضرت میاں میر نے امرتسر کے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مزید بھی سنیے.... دریائے سندھ، جو کہ پاکستان کی شہ رگ ہے، اس کا آغاز ادیو گی شیوا دیوتا کے چرنوں سے ہوتا ہے۔ تبت میں کوہِ کیلاش کو شیوا تصور کیا جاتا ہے۔ ہر برس ہزاروں ہندو، بدھ اور جین پیروکار کوہِ کیلاش کے گرد ۵۳ کلومیٹر طویل طواف کرتے ہیں۔ کیلاش کے ایک گلیشیئر سے دریائے سندھ کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے اہم ترین دریا بھی کیلاش سے نکلتے ہیں۔

مگر یہاں ایک خفیہ بات ہے۔ شاید کچھ احباب کو یہ بات ہضم نہ ہو کہ شیوا دیوتا کے جنسی عضو کی عبادت کی جاتی ہے۔ کوئی بھی ایسا پربت جس سے پانی جاری ہوتا ہو، اُسے شیوا کا "لنگھ" کہا جاتا ہے اور اُس کے زرخیز پانی "یونی" کی جانب سفر کرتے ہیں، تب تخلیق کا عمل ہوتا ہے۔ یعنی دریائے سندھ اصل میں شیوا کے زرخیز پانی ہیں، یا خلا کی ایک شکل ہے۔ ہنگول بلوچستان میں چندرا گپ گارفشاں پر چڑھتے ہندو بھی شیوا کے پیروکار ہیں کیونکہ وہ چندرا گُپ کو شیوا کا لنگھ سمجھتے ہیں۔ جس طرح چندرا گُپ کی نوک سے زرخیز پانی برآمد ہوتے ہیں، دیکھنے والے کو شرم ہی آ جاتی ہے۔ کلر کہار میں کٹاس راج مندر بھی شیوا ٹیمپل ہے۔ ہر شیوا ٹیمپل میں لنگھا یونی کی مورتیاں نظر آتی ہیں۔ غالباً کٹاس راج میں بھی موجود ہیں مگر انہیں روپوش کر دیا گیا تاکہ عوام مذاق نہ بنا لے۔ اسی مناسبت سے سانپ کو بھی شیوا کی جنسی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شیوا کے کندھے پر سانپ بٹھایا جاتا ہے۔ بہر حال، یہ مجسمہ وہی ادیو گی شیوا کی خیالی تصویر ہے۔

حروفِ آخر کے طور پر بھی استغفر اللہ، معاذ اللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، بڑائی صرف خدا کے لیے ہے..

احتیاطاً طہارت کر لیں، آپ کو آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

❁❁❁